سوال و جواب

جلد اوّل

مولانا وحید الدّین خاں

سوال وجواب

(الرسالہ سے ماخوذ)

جلد اوّل

مولانا وحید الدین خان

Sawal-O-Jawab

By Maulana Wahiduddin Khan

First Published - 2017

This book is copyright free

Goodword Books

1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013

Tel : 9111-4182-7083-4652-1511

Fax : 9111-4565-1771

email : info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Printed in India

دیباچہ

زیر نظر کتاب راقم الحروف کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو ماہنامہ الرسالہ میں سوال وجواب کے کالم کے تحت چھپتے رہے ہیں۔ اس مجموعہ کو برادرم اصطفاء علی صاحب نے کولکاتا ٹیم کے تعاون کے سے تیار کیا ہے، اور کولکاتا ٹیم اپنے اہتمام کے ساتھ اِس کو شائع کررہی ہے۔ ان لوگوں کی یہ کوشش بلا شبہ ایک مستحسن کوشش ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کولکاتا ٹیم کواس کام کے لئے جزائے خیر عطا فرمائے، اوراس کے پڑھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ان کی زندگی کے لئے مفید ثابت ہو۔ آمین

سوال وجواب کا طریقہ بہت قدیم طریقہ ہے۔ یہ طریقہ اپنے اندر بہت سے فوائد رکھتا ہے۔ سوال کرنے والے کے لئے بھی، اور جواب دینے والے کے لئے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال وجواب ایک باہمی تعلم (**mutual learning**) کا طریقہ ہے۔ اس طریقے میں سائل اور مجیب دونوں کے لئے یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ مزید مطالعہ کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کریں۔ وہ زیر بحث مسئلے کے نئے گوشوں کو دریافت کریں ۔ اس طرح یہ طریقہ طرفین کے لئے فکری ارتقاء (**intellectual development**) کا ذریعہ ہے۔

اسلام میں سوال کے بجائے تدبر اور تفکر پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت خضر کے ساتھ حضرت موسیٰ جب سفر پر روانہ ہوئے تو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا : فَلَا تَسْـَٔلنِی عَنْ شیءٍ: (**18:70**)۔ یعنی تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سوال نہ کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن میں کوئی سوال آئے تو پہلے غور وفکر کرو۔ غور وفکر کرکے آدمی پہلے اپنے آپ کو ذہنی اعتبار سے تیار کرتا ہے۔ سوال وجواب وہی شخص درست طور پر سمجھتا ہے، جو پہلے سے اپنے آپ کو ایک تیار ذہن (**prepared mind**) بنا چکا ہو۔

اس حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں: وعن کثرۃ **السوال** (مسند احمد، حدیث نمبر **18232**)۔ یعنی رسول اللہ نے ہم کو زیادہ سوال سے منع کیا تھا۔ سوال

کی کثرت سے منع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی سوال نہ کرے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پہلے خود سوال کے تقاضے کو پورا کرے، اس کے بعد وہ سوال کرے۔

اس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ سوال کرنے سے پہلے آدمی خود غور وفکر کرے۔ اس طرح اس کو ذہنی ارتقاء (intellectual development) کا فائدہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذہن میں غیر معمولی صلاحیت پیدا کی ہے۔ یہ صلاحیت غور وفکر سے بڑھتی ہے۔ اپنے ذہن کو ترقی دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو تیار کرتا رہے۔ وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ اخذ (grasp) کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ کوئی شخص اس کے سوال کا جواب دے تو وہ اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کر سکے۔ حقیقی سائل وہ ہے جو جواب کو سن کر اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر سکتا ہو۔

مذکورہ حدیث کا مطلب اگر لفظ بدل کر بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا ..... سوال کیوں کرتے ہو۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال آیا ہے تو پہلے خود اپنے ذہن کو استعمال کر کے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ سوال کو صرف سوال نہ سمجھو، بلکہ اس کو اپنے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بناؤ۔ بات کو سن کر فوراً سوال کرنا، عجلت پسندی کی علامت ہے۔ بات کو سن کر پہلے غور وفکر کرنا چاہئے۔ اگر غور وفکر سے وہ بات تک نہ پہنچے تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اپنے ذہن کو تیار کرنے میں کمی کی ہے۔ اس کی توجہ اس پر ہونی چاہئے کہ وہ اپنے ذہن کو مزید تیار کرنے کی کوشش کرے۔

وحیدالدین

نئی دہلی، 4 جنوری 2017

سوال

بہت سے لوگ جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھتے ہیں اور اس کا بہت ثواب بتاتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کی تحقیق کیا ہے؟۔ (الرسالہ جنوری ۱۹۷۷ء)

جواب

متعدد روایتوں میں سورہ کہف کو جمعہ کے دن پڑھنے کی فضیلت بتائی گئی ہے۔ مگر یہ تمام روایتیں ضعیف ہیں۔ قوی روایت صرف وہ ہے جس کو احمد اور مسلم نے قتادہ سے نقل کیا ہے: من حفظ عشر آیات من اول سورۃ الکھف عصم من الدجال۔ جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو محفوظ رکھا وہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ اس روایت میں نہ تو ''پڑھنے'' کا ذکر ہے نہ ''جمعہ'' کے دن کا۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں میں جو تعلیم دی گئی ہے، جو شخص ان کو ذہن نشیں کر لے گا اور ان کو اپنی زندگی میں ملحوظ رکھے گا، وہ دجال کے ظہور کے وقت اس کے فتنہ سے بچا رہے گا۔

اب سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو دیکھئے۔ غور کیا جائے تو ان میں دو اسوہ ملتا ہے۔ ایک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ جو لوگوں کو خدا پرست بنانے کی کوشش میں اپنے کو ہلاک کئے دے رہے تھے۔ (کہف۔ ۶) دوسرے آپ سے قبل کے کچھ صالح نوجوان (اصحاب کہف) کا اسوہ جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ لوگوں کے درمیان اپنے دین کو بچا نہیں سکتے، بستی سے نکل کر غاروں میں جا چھپے (کہف۔ ۱۰)

سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کا سبق یہ ہے کہ جب زمین پر فتنہ کی حالت پیدا ہو جائے اور خدا کی خلاف ورزی ہونے لگے، تو اہل ایمان کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اول یہ کہ غافل اور سرکش لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ دیکھیں کہ معاملہ اس نوبت کو پہنچ چکا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے بجائے وہ خود اپنے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر لیں گے تو ایسی حالت میں انھیں چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عوام الناس سے الگ کر لیں اور

کسی گوشے میں سمٹ کر زندگی کے بقیہ ایام پورے کر کے مر جائیں..... پہلی صورت اقدام کی ہے، دوسری تحفظ کی۔

سوال

ایک صاحب قاہرہ سے لکھتے ہیں:

''آپ کی کتاب جو یہاں حکمة الدین کے نام سے شائع ہوئی ہے اس پر ایک جدال پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے سخت موید ہیں اور کچھ لوگ سخت مخالف۔ قاہرہ یونیورسٹی کے طلبا کے درمیان اس کتاب کے بارے میں سمینار بھی ہو چکا ہے۔ مخالف گروپ کا کہنا ہے کہ آپ نے جہاد ہی کو ختم کر دیا ہے اور دین کو صوم وصلوٰۃ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کے جرائد میں بعض تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں''۔ (الرسالہ فروری ۱۹۷۷ء)

جواب

جہاد بلاشبہ اسلام میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر جہاد کو قتال کے معنی میں لینا اتنا ہی غلط ہے جتنا اس کو دین کی فہرست سے خارج کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ امت محمدی کا جہاد، دعوت ہے۔ قرآن میں شہادت حق کی راہ میں قوت صرف کرنے کو جہاد کہا گیا ہے (حج۔ آخر) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کے اوپر تبلیغی جہاد کرو (فرقان۔ ۵۲)۔ قرآن میں دعوت کا حکم آیا تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک بھاری حکم (مزمل۔ ۵) قرار دیا۔ دعوت وتبلیغ کو اتنا بڑا کام بتایا گیا کہ اس میں پوری طرح لگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہلکان کر لے (لَعَلَّکَ باخِعٌ نَّفْسَکَ) موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تحریکوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان میں یہ غلطی سر فہرست ہے کہ انھوں نے جہاد کا مطلب قتال یا سیاسی معرکہ آرائی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کا میدان، دعوت کے بجائے سیاست بن گیا اور مومنانہ سرفروشی کے جذبہ کی تسکین کے لئے اس دنیا میں صرف دو کام باقی رہ گئے..... اگر موقع ہو تو تلوار زنی ورنہ تقریر بازی۔ مصر، الجزائر اور ہندوستان اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ان علاقوں میں جب ''استعمار'' یا ''باطل اقتدار'' کے خلاف جنگ وپیکار کے مواقع تھے تو لاکھوں مجاہدین اپنے جان ومال کی قربانی دیتے رہے، اور جب اس کا موقع ختم ہو گیا تو اب انھیں اس کے سوا کوئی کام نظر نہیں آتا کہ مفروضہ طاغوتی سیاست کے خلاف تحریر وتقریر کے لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اور جب اس کا موقع بھی باقی نہ

رہے تو گوشہ گیر ہو کر ''ختم خواجگان'' کے دور شروع کر دیں !

جہاد ہی وہ طاقت ہے جس سے اسلام اس زمین پر قیام و استحکام حاصل کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر جذبہ جہاد کے استعمال کے باوجود اسلام کو اس دور میں قیام و استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا جذبہ اپنے نکاس کا صحیح راستہ نہ پا سکا اور غلط سمت میں بہہ کر ضائع ہو گیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک بڑے دریا کا پانی بے پناہ مقدار میں بہہ کر سمندر میں جا گرے اور اس کے ساحل کے دونوں طرف کھیتیاں پانی نہ ملنے کے باعث سوکھ کر ختم ہو رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ دریا کے پانی کو ان کھیتوں کی طرف موڑنے کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔

دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے کان میں کچھ الفاظ ڈال دیئے جائیں یا ان کی غلط روش پر تنقید کر دی جائے..... حقیقت یہ ہے کہ دعوت ایک انتہائی قربانی کا عمل ہے۔ اپنا وقت، اپنے جذبات، اپنا مال غرض اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو دعوت کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ مدعو کے لئے داعی کے دل میں انتہائی خیر خواہی ہو، جو بات کہی جائے وہ قول بلیغ کی زبان میں اور مخاطب کی اپنی قابل فہم اصطلاحوں میں ہو، مدعو کی طرف سے ہر قسم کی ایذا پر مکمل صبر کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے کسی اجر کی توقع نہ رکھتے ہوئے اپنا مال اور اثاثہ اس راہ میں خرچ کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے اعراض پر جھنجلانے کے بجائے اس کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں، ہر ممکن طریقے سے مدعو کی تالیف قلب کی جائے۔ دعوتی کام کو مسلسل تا عمر جاری رکھا جائے۔ ایسا ایک عمل اگر اس کے پورے آداب کے ساتھ شروع کیا جائے اور اس کا مکمل حق ادا کیا جائے تو یہ اتنا بڑا اور اتنا نفس کش عمل ہے کہ بڑے سے بڑے انسان کی شخصیت اس کی ذمہ داریوں سے بلبلا اٹھے اور کبھی اس کی ادائیگی کی طرف سے اپنے کو سبکدوش نہ سمجھے۔

اس دعوتی عمل کے ظہور کے لئے قدیم زمانہ میں جو طریقے رائج تھے، اب ان میں بے شمار

نئے طریقوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں دعوتی کام نے بھی، تدابیر اور ذرائع کے اعتبار سے، نئی وسعت اختیار کرلی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا جہاد آج اتنا وسیع الاطراف ہو چکا ہے کہ ''پٹرو ڈالر'' کی مہیب دولت بھی اس کا حقیقی بل ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس زمانی فرق کو دیگر مذاہب، مثال کے طور پر عیسائیت نے خوب سمجھا اور اس کو بھرپور طور پر اپنے دین کی تبلیغ واشاعت کے لئے استعمال کیا۔ مگر مسلمان اس میدان میں اس قدر پیچھے ہیں کہ جدید امکانات کا انھیں شعور تک نہیں۔ حتیٰ کہ دعوتی کام ان کو اتنا معمولی نظر آتا ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے پھسپھسے کام کو جہاد کس طرح کہا جاسکتا ہے !

سوال

آپ کی کتاب ''فکر اسلامی'' پڑھی۔ بظاہر اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک حریت پسند آدمی ہیں۔ کیا یہ لفظ آپ کے لئے بولنا درست ہوگا؟ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

حریت پسند کا لفظ میرے لئے درست نہیں۔ اگر آپ میری تمام کتابیں پڑھیں تو آپ کی یہ غلط فہمی دور ہوجائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پورا فکر قرآن وحدیث اور علماء حق کے مطالعہ سے ماخوذ ہے۔ میں مکمل طور پر ''تقلیدی اسلام'' کا حامی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں قدیم بات کو جدید اسلوب میں بیان کرتا ہوں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مرحوم قاری محمد طیب صاحب ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے..... مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں۔

(ماہ جولائی ۱۹۹۱ء میں پٹنہ کے گورنمنٹ اردو لائبریری کے ہال میں ''الرسالہ سمپوزیم'' کا انعقاد ہوا تھا۔ جس میں مولانا نے تقریر کی تھی۔ اس سمپوزیم میں کیا گیا ایک سوال بطور نقل نمونہ یہاں کیا جاتا ہے۔)

سوال

اِس وقت مسلم دنیا میں بہت سی اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں۔ آپ اپنے اور ان کے درمیان کیا فرق سمجھتے ہیں؟

جواب

ان مختلف تحریکوں کو وسیع تقسیم (**broad division**) میں دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو اسلام کو دعوت وتبلیغ کے مشن کے طور پر لے کر اٹھی ہیں۔ دوسری وہ جو سیاسی انقلاب کے مقصد کے تحت کام کر رہی ہیں۔ ایک کا نشانہ اگر ''دعوتی اسلام'' ہے۔ تو دوسرے کا نشانہ ''سیاسی اسلام''۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہی تحریک صحیح اسلامی تحریک ہے جو ''دعوتی اسلام'' کے لئے اٹھے۔ ''سیاسی اسلام'' کو لے کر اٹھنے والوں کا کیس صراط مستقیم سے انحراف (**deviation**) کا کیس ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اتباع سبل ہے نہ کہ اتباع صراط۔

یہ اس معاملہ کا نظری پہلو ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ دعوتی اسلام کی موجودہ تحریک زیادہ تر ''فضائل'' کی بنیاد پر چلائی جارہی ہے، جب کہ سیاسی یا انقلابی اسلام کی تحریک ''دلائل'' کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دعوتی اسلام کے مشن کی صحت کے باوجود امت کا انٹلکچول طبقہ (**intellectual class**) ابھی تک اس سے جُڑ نہ سکا۔

یہ طبقہ جس کو خواص کا طبقہ کہا جاسکتا ہے، وہ اپنی ذہنی ساخت کی وجہ سے بات کو دلائل کے اسلوب میں سمجھنا چاہتا ہے، مگر دعوتی اسلام کے حاملین کا موجودہ انداز خطاب ان کے دلائل پسند مزاج کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ اسی بنا پر آج یہ صورت حال ہے کہ امت کے طبقۂ خواص کا بیشتر حصہ سیاسی اسلام سے قریب اور دعوتی اسلام سے دور ہے۔

الرسالہ مشن کا خاص مقصد ''دعوتی اسلام'' کو دلائل کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہے تاکہ امت کا ذہن اور باشعور طبقہ دعوتی اسلام کی اہمیت کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس مہم میں لگائے۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔

کیوں کہ امت کا طبقۂ خواص جب تک دعوتی مشن میں نہ لگے، صرف طبقۂ عوام کی بنیاد پر کوئی گہری تحریک برپا نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

''دعوتی اسلام'' کے موجودہ طریقہ کے ذریعہ محدود معنوں میں عوام کے اندر کچھ اصلاح کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ اسلام کی از سر نو تاریخ بنانے کا ہے جس کو تجدید دین کہا جاسکتا ہے، اور حقیقی تجدید دین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وقت کے اہلِ علم کو دعوتی اسلام کا حامی نہ بنایا جائے۔ (تفصیلات کیلئے رجوع کریں الرسالہ دسمبر ۱۹۹۱ء)

سوال

قربانی (ذبیحہ) جذبۂ رحم کے منافی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جانوروں کے تڑپنے کے بعد جو گوشت ہمیں کھانے کو ملتا ہے اس کی تڑپ اگر ذہن میں رکھئے تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب کہ یہ گوشت کھانا اسلام میں جائز ہے۔ (شکیل احمد، ورورہ، چندر پور)

جواب

یہ مسئلہ صرف قربانی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود قانون فطرت کا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، آپ خواہ کچھ بھی کریں۔ ہوا میں سانس لیں، پانی پئیں، سبزی کھائیں، دودھ پئیں۔ ہر حال میں آپ جانوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ قربانی میں ایک جانور کو ہلاک کیا جاتا ہے اور عام حالات میں بیکٹیریا کو۔ اور زندہ جسم ہونے کے اعتبار سے جانور اور بیکٹیریا میں کوئی فرق نہیں۔

زندہ رہنے کے لئے ہمیں خوراک کی ضرورت ہے اور فطرت نے زندہ اشیاء ہی کو ہماری خوراک بنایا ہے۔ غیر زندہ اشیاء (مردہ حیوان یا پتھر وغیرہ) کو ہم اپنی خوراک نہیں بنا سکتے۔ ایسی حالت میں اصل سوال قربانی کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آدمی زندہ رہے یا خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کرلے۔ کسی کو یہ حق تو ہے کہ وہ کھانا پانی چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاک کرلے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ قربانی نہ کرو۔ کیوں کہ قربانی تو ہر آدمی عملاً کر رہا ہے۔ ہر آدمی ہر لمحہ ہزاروں جانوں کو مار کر انہیں اپنی خوراک بناتا ہے اس کے بعد ہی وہ اس دنیا میں زندہ حالت

میں باقی رہتا ہے۔ قربانی اس دنیا میں زندگی کا ایک عام قانون ہے، وہ مخصوص طور پر جانور کے ذبیحہ سے متعلق مسئلہ نہیں۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ چیزوں سے نہیں ہوتا، خدا سے ہوتا ہے۔ خدا سے ہونے کا یقین اور اسباب سے کچھ نہ ہونے کا یقین۔ یہ کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں بتائیں۔

(شکیل احمد ورورہ، چندر پور)

جواب

اس مسئلہ کا جواب حدیث (الترمذی، کتاب القیامہ) میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک مسلمان نے کہا کہ اے خدا کے رسول میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو۔

(یا رسول اللہ اعقلھا واتوکل او اطلقھا واتوکل قال اعقلھا وتوکل)

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہے یہی معاملہ توکل کا ہے۔ اس دنیا کا نظام بظاہر اسباب وعلل پر قائم ہے۔ یہاں کے حالات کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح اسباب کی رعایت کرتے ہوئے اپنا عمل کرے۔ اس کے باوجود اس کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا ہے۔ پھر بھی اس کی کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے ہر قسم کے اسباب فراہم کرے، مگر داخلی طور پر اس کا یقین یہ ہو کہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا۔ خدا کے حکم کے بغیر یہاں نہ کسی کو کچھ ملنے والا ہے اور نہ کسی سے کچھ چھینا جانے والا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ زکاۃ اور صدقات میں برکت ہے اور سود میں برکت نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟۔ براہ کرم تشریح فرمائیں۔ (مشتاق احمد دہلی)

جواب

یہاں برکت کا لفظ کسی پراسرار معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ معلوم اقتصادی معنی میں ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ زکاۃ یا صدقہ دوسروں کو دینے کا عمل ہے۔ اس کے برعکس سود دوسروں سے لینے کا عمل۔ کسی سماج میں جب ایسا ہو کہ لوگ اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دینے لگیں تو وہاں عمومی خوش حالی پیدا ہوگی۔ کمایا ہوا مال صرف کمانے والے کے پاس نہیں رہے گا بلکہ توسیع پا کر وہ دوسروں تک بھی پہنچتا رہے گا۔ اس کے مقابلہ میں سودی نظام میں یہ ہوگا کہ کچھ لوگ قرضوں کے ذریعہ دوسروں کے مال کا ایک حصہ اپنے لئے حاصل کرتے رہیں گے۔ سماج کی دولت پورے سماج میں گردش نہیں کرے گی بلکہ وہ کچھ افراد کے پاس سمٹ کر رہ جائے گی۔ یہی مطلب ہے بے برکتی کا۔ زکاۃ اور صدقہ کا طریقہ خوش حالی کو عمومی بناتا ہے اور سود کا طریقہ خوشحالی کو کچھ لوگوں تک محدود کر دیتا ہے۔

سوال

آپ غیر مسلموں کے اجتماعات میں جاتے ہیں۔ دعوتی اعتبار سے ایک اچھی بات ہے۔ مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے، آپ وہاں اسلامی عقائد کو پیش نہیں کرتے بلکہ اسلام کے اخلاقی تعلیمات اور معاملات کو پیش کرتے ہیں۔ دعوت کا یہ طریقہ درست نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ سنت نبوی کے مطابق اسلامی عقائد کو ان کے سامنے پیش کریں۔ (زکی نور عظیم ندوی، لکھنؤ)

جواب

آپ کی یہ اطلاع درست نہیں، دعوت کوئی ایک ریکارڈ بجانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخاطب کی نفسیات اور موقع و محل کی رعایت سے کوئی بات پیش کرنے کا نام ہے اور میں خدا کے فضل سے یہی کرتا ہوں۔ مثلاً غیر مسلموں کے ایسے کئی اجتماعات ہیں جن میں میں نے ویدانت کی فلاسفی (ادویت واد) کے مقابلہ میں اسلام کے تصور توحید کو پیش کیا۔ بعض اجتماعات میں جہاں ایسے لوگ اکٹھا تھے جو اسلام کو تشدد پسند مذہب سمجھتے تھے، ان کے سامنے اسلام کو رحمت کلچر کے طور پر پیش کیا۔ اسی طرح بعض اور اجتماعات میں جہاں ایسے مخاطبین تھے جو اسلام کی تاریخ کے بارے میں شک وشبہ میں

تھے، وہاں اسلامی تاریخ کی صحیح تصویر پیش کی۔ بعض اور موقع پر جہاں محسوس ہوا کہ لوگ اسلام کے نام سے متوحش ہوتے ہیں وہاں یہ توحش دور کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اسلام کا مطالعہ کرنے لگیں۔ بعض مواقع پر جہاں لوگ مسلمانوں کے بعض اعمال کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں بدگمان ہو رہے تھے۔ وہاں بتایا کہ اسلام کو سمجھنے کا ماخذ قرآن وسنت ہے نہ کہ مسلمانوں کی روش۔ یہی طریقہ سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ اسی کو ایک صحابی نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: **کلم الناس علی قدر عقو لھم** ۔

سوال

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کا ماہانہ رسالہ بھی دیکھتا ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلم اکابر کو ہدف تنقید کیوں بناتے ہیں؟۔ آپ اس کے بغیر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ آپ جب مسلم اکابر کا نام لے کر ان کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو اس سے قاری کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (محمد خالد ندوی)

جواب

آپ کی یہ شکایت دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ اس قسم کی تحریروں کی بابت یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کچھ شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ میرا مقصد ۲۰ویں صدی کے ایک انوکھے ظاہرہ (**Phenomenon**) کی توجیہہ ہوتا ہے۔ اس ظاہرہ کے ساتھ چونکہ بہت سی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کے نام حوالہ بھی ضمناً ان تحریروں میں آجاتا ہے۔ وہ انوکھا ظاہرہ یہ ہے کہ ۲۰ویں صدی میں اسلام کے نام پر بہت بڑی بڑی کوششیں اور قربانیاں سامنے آئیں۔ مگر ان کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تاریخ اسلام کے اس انوکھے ظاہرہ کی توجیہہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ضمنی طور پر شخصیتوں کے نام بھی آجاتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی شخصیت کو الزام دینا نہیں ہوتا بلکہ ایک تاریخی ظاہرہ کی توجیہہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ اگر اس فرق کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو آپ کو میری ان تحریروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

سوال

ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ بہت پرانا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی تھا اور ۱۹۴۷ کے بعد بھی باقی ہے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی جڑ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟۔ آپ اس مسئلہ کا ذمہ دار کس کو سمجھتے ہیں؟۔ (نصیر احمد، سہرسا)

جواب

میرے نزدیک یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اس معاملہ کی پچاس فیصد ذمہ داری ہندوؤں پر ہے اور پچاس فیصد ذمہ داری مسلمانوں پر۔ ہندوؤں کی غلطی کی جڑ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ''غیر'' کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی مسلمانوں کی ۹۹ فیصد تعداد خود ہندوؤں سے ہی نکل کر آئی ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ سارے مذاہب ایک ہیں اور تمام مذاہب سچے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کچھ ہندوؤں نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کر لیا تو ہندو عقیدہ کے مطابق، وہ ایک سچے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے سچے مذہب میں داخل ہو گیا۔ ایسی حالت میں کم از کم ہندوؤں کو ہرگز اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے اور نہ ایسے مسلمانوں کو غیر سمجھنا چاہئے۔ مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ قدیم ہندوستان کے مسلم حکمرنوں کو ''اِسلامی حکمراں'' قرار دیتے ہیں اور ان کا دفاع اسی طرح کرتے ہیں جس طرح انھیں اسلام کا دفاع کرنا چاہئے۔ چونکہ ہندو ان حکمرانوں کو حملہ آور سمجھتے ہیں اس لئے جب مسلمان ان کی حمایت کرتے ہیں تو ہندوؤں کو ایسے مسلمانوں سے بھی شکایت ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی طرف یہ صرف سوچ کی ایک غلطی کا معاملہ ہے، وہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

سوال

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قائد نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی قائد ہے تو وہ کون ہے؟۔ اگر کوئی قائد نہیں ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟۔ آخر مسلم ملت قیادت سے خالی کیوں ہو رہی ہے؟۔ (نسیم احمد اعظمی، مئو)

جواب

یہ سوال بہت زیادہ دہرایا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ درست نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا مسئلہ فقدان قیادت نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مسئلہ فقدان قبولیتِ قیادت ہے۔ ایک ہندی مثل ہے کہ مانو تو دیو، نہیں تو پتھر۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی اہل ہو، وہ خود سے اپنی قوم کا قائد نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ قوم کے قبول کرنے سے قائد بنتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح دونوں ہم عصر تھے۔ تقریباً بلا اختلاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اندر قیادت کی اعلیٰ صلاحیت موجود تھی۔ امکانی طور پر مسٹر محمد علی جناح سے زیادہ بڑے قائد تھے۔ مگر اس زمانے کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیت قائد کے قبول نہیں کیا۔ اس کے مقابلہ میں مسٹر محمد علی جناح کو مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی مقبولیت ملی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح قائد اعظم بن گئے اور مولانا ابوالکلام آزاد صرف شوبوائے بن کر رہ گئے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کا یہی مزاج آج بھی باقی ہے۔ وہ اہل افراد کو اپنا رہنما بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل افراد پیدا ہو کر مر جاتے ہیں اور وہ قیادت کے میدان میں اپنے فرائض ادا نہیں کر پاتے۔

سوال

آپ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں بھی اس نام سے چھپ چکی ہے۔ **Islam the creator of the modern age** لیکن میں نے مریم جمیلہ صاحبہ کا ایک تبصرہ پڑھا جس میں وہ لکھتی ہیں کہ اسلام دور جدید کا خالق نہیں ہے بلکہ اسلام دور جدید کا انتخاب ہے:

Islam is not the creator of modern age , but the option of modern age

یہ بات انھوں نے اپنی کتاب **Islam and the west** میں لکھی ہے۔ آپ اس کے

جواب میں کیا کہتے ہیں؟۔(ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

یہ بات درست ہے کہ اسلام دور جدید کا انتخاب (choice) ہے۔ جدید ذہن سائنٹفک مذہب چاہتا ہے، اور ایسا مذہب صرف اسلام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی بلاشبہ درست ہے کہ اسلام جدید سائنسی دور کا خالق ہے۔ مریم جمیلہ صاحبہ کو اس معاملہ میں غلط فہمی شاید اس لئے ہوئی کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں ڈائرکٹ معنوں میں یہ بات کہتا ہوں۔ یعنی ڈائرکٹ طور پر اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ مثلاً یہ کہ کار اور ہوائی جہاز کی ٹکنالوجی قرآن نے دی ہے۔ مگر یہ میرا کہنا نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے تو میں اس کو بالواسطہ مفہوم (indirect sense) میں کہتا ہوں۔ اسلام کا مقصد اصلاً شرک کو ختم کرنا اور توحید کو قائم کرنا تھا۔ مگر مشرکانہ ذہن کا خاتمہ جدید سائنس کے آغاز کا سبب بن گیا۔ جیسا کہ میں نے کتاب (اسلام دور جدید کا خالق) میں دکھایا ہے کہ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مشرکانہ عقائد کا غلبہ تھا۔ اس مشرکانہ عقیدہ نے نیچر ورشپ پیدا کی اور نیچر ورشپ نیچر کی تحقیق میں رکاوٹ بن گئی۔ اسلامی انقلاب کے ذریعہ اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں نیچر کی آزادانہ تحقیق کا عمل شروع ہوا جو بالآخر جدید سائنسی انقلاب تک پہنچا۔

سوال

مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ جس کی کئی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے قرآن نے جن چیزوں کے بارے میں مجمل اشارے کئے تھے وہ تمام اشارات حالیہ سائنسی انکشافات کے نتیجہ میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ گویا کہ ثابت شدہ سائنس اور قرآن کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ لیکن دوسری طرف دیگر مذاہب سے متعلق قومیں (یہود و نصاریٰ) بھی اپنی اپنی مقدس کتابوں کے بارے میں یہی دعویٰ کرتی ہیں اور یہ قومیں بھی اپنی کتابوں کے حق میں سائنسی تصدیقات موجود ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قرآن کے دعوے میں ایسی کوئی وجہ امتیاز ہے جو اس کو دوسرے دعاوی سے الگ کرتی ہو؟۔(ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قدیم آسمانی کتابوں میں اگر چہ تحریف ہوئی ہے اوران میں انسانی کلام شامل ہوگیا ہے۔تاہم ان میں اب بھی ایسے کچھ اجزأ موجود ہیں جو خدائی الہام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان اجزأ میں ایسی باتیں ہیں جو بعد کو دریافت ہونے والی سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔مگر اسی کے ساتھ ان میں انسانی کلام کا جو حصہ ملا ہوا ہے اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔اس دوسرے جز میں واضح طور پر ایسی مثالیں موجود ہیں جن کی تصدیق سائنسی دریافتوں سے نہیں ہوتی۔اس طرح دوسری مقدس کتابوں میں دونوں قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں، مطابق بھی اور غیر مطابق بھی۔مگر قرآن کی صفت یہ ہے کہ وہ پورا کا پورا محفوظ الہام کی حیثیت رکھتا ہے، وہ انسانی ملاوٹ سے مکمل طور پر پاک ہے اس لئے قرآن پورا کا پورا سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔جو چیز دوسری مقدس کتابوں میں صرف جزوئی طور پر پائی جاتی ہے وہ قرآن میں کلی طور پر موجود ہے یہی اس معاملہ میں قرآن کا امتیازی وصف ہے۔اس معاملہ کی تفصیلی مثالیں راقم الحروف کی کتابوں (مثلاً عظمت قرآن وغیرہ) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

سوال

آج کل ہمارے یہاں یہ ذکر زوروں پر ہے کہ آپ نے وندے ماترم کہنا مسلمانوں کے لئے جائز کر دیا ہے۔اگر یہ جائز ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے بہت قریب لا دے گا۔دشمنی ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔لیکن اگر مسلمان زمین کی وندنا کر سکتا ہے تو پھر ہمالہ، گنگا ،سرسوتی، گائے وغیرہ کی وندنا کیوں نہیں کر سکتا اور اگر کر سکتا ہے تو پھر شرک کیا ہے؟۔

(شاکر وارث۔مراد آباد)

جواب

وندے ماترم کی شرعی نوعیت کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو دوسرے علماء کی رائے ہے۔اس معاملہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری اردو کی زرد صحافت پر ہے۔اس موضوع پر میرے آرٹیکل کا عنوان یہ تھا.....وندے ماترم: اشویانان اشو۔اردو اخبار والوں نے اس کو بدل کر ”وندے ماترم، جائز یا ناجائز“ بنا دیا۔اس بدلے ہوئے عنوان کی بنا پر لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں وندے ماترم کو جائز بتا رہا ہوں۔حالانکہ اصولی اعتبار سے اس

کے جائز ہونے کا کوئی سوال نہیں اور نہ میں نے کبھی ایسا کہا۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ اس معاملہ کو عوامی احتجاج کا اشو نہ بنایا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات میں عوامی احتجاج صرف الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ اسکولوں میں وندے ماترم کو لازمی ٹھہرانا دستور کے خلاف ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دستوری نزاع کا فیصلہ جلسوں اور تقریروں کے اسٹیج پر نہیں ہوتا۔ اس کے فیصلہ کا مقام عدالت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں چاہئے کہ ہم ایک طرف متبادل اسکول قائم کریں اور دوسری طرف اپنی جدوجہد کے لئے عوامی مظاہرہ کے بجائے عدالتی طریقہ اختیار کریں۔ گویا کہ میرا اختلاف نفس مسئلہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ طریق کار کے بارے میں ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں کسی اقلیت کے لئے مظاہراتی طریقہ ہمیشہ ناکام ہوگا۔ اور عدالتی طریقہ ہمیشہ کامیاب۔ مظاہراتی طریقہ میں فیصلہ کن چیز تعداد ہوتی ہے۔ یہاں اقلیتی گروہ اپنی عددی کمی کی بنا پر کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کے بر عکس عدالتی طریقہ میں سارا انحصار دلیل پر ہوتا ہے اس لئے جو گروہ حق ہو اس کی کامیابی یقینی بن جاتی ہے گویا کہ ایک صورت میں فیصلہ کی بنیاد ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دوسری صورت میں فیصلہ کی بنیاد فریق ثانی کے ہاتھ میں۔ وندے ماترم ابھی تو لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو لازم کیا جائے تو اس کو چیلنج کرنے کی صحیح جگہ عدالت ہے نہ کہ عوامی اسٹیج۔

سوال

قرآن میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ نماز پڑھنے کا نہیں تو موجودہ پڑھی جانے والی نماز کن احکامات کی روشنی میں پڑھی جارہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز قائم کرنے کا مطلب نظم ونسق درست کرنا ہے اور یہ کہ سجدہ کا مطلب تعمیل حکم ہے یہ کہاں تک درست ہے۔ (محمد بدرالدین شمیم، ناگپور)

جواب

صلّی کا مطلب نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ نماز ادا کرنا ہے۔ اسی طرح اقام کا مطلب نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس طرح اقام کا مطلب بھی وہی ہے جو صلی کا مطلب ہے۔

البتہ اقام کے لفظ میں اہتمام کے ساتھ ادائیگی کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر علمی اعتراض ہے۔ قرآن میں نماز کا حکم صرف اقام کے لفظ کے ساتھ نہیں آیا ہے بلکہ مختلف الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً صلّی، حافظ، وغیرہ۔ ان الفاظ کے لغوی معنی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ مگر سب کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ نماز کو پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ قرآن میں اقام کے سوا جن الفاظ کے ساتھ نماز کا حکم آیا ہے ان میں سے کچھ کے حوالے یہ ہیں کہ: القیامۃ ۳۱، العلق ۱۰، الکوثر ۲، المعارج ۲۲، المدثر ۴۲، النساء ۱۰۲، البقرہ ۴۵، البقرہ ۱۵۳، البقرہ ۲۳۸ وغیرہ۔ احادیث میں بار بار نماز کا ذکر لفظ اقامت کے بغیر آیا ہے۔ تاہم صلن کا مطلب بھی عین وہی ہے جو اقم الصلاۃ کا ہے۔ اقامت کا لفظ دراصل برائے وضاحت ہے۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے وضاحتی الفاظ بھی آئے ہیں مثلاً محافظت یا خشوع وغیرہ۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو پوری پابندی کے ساتھ اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے اس کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا جائے۔ نماز کو اس کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں کے اعتبار سے انجام دیا جائے۔ یہی مطلب ہے نماز کی اقامت کا۔ نماز ثابت شدہ طور پر ایک عبادتی فعل ہے۔ اسلام میں نظم ونسق اور احکام کی تعمیل بھی ہے۔ مگر ان چیزوں کا حکم دوسری آیات سے نکلتا ہے نہ کہ نماز کی آیات سے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جن آیتوں میں اقامت کا لفظ آیا ہے وہاں بھی قائم کرنے کا حکم ہے نہ کہ کچھ اور قائم کرنے کا۔ اس لئے ان آیتوں میں بھی نماز ہی کی اقامت، بالفاظ دیگر نماز کی کامل ادائیگی مراد ہوگی نہ کہ نماز کے سوا اور خود ساختہ چیز کی اقامت یا ادائیگی۔

بے خبری کی سب سے عجیب قسم یہ ہے کہ آدمی جس حقیقت کو اپنی ذات کے معاملہ میں جانے اس کو وہ دوسروں کے معاملہ میں بھول جائے۔

مئی ۸۹

سوال

ہمارے علمی حلقہ کے ایک دوست کا اصرار ہے کہ آپ سے سوال معلوم کیا جائے۔ وہ یہ کہ ان کے ایک دوست جو کبھی آپ کے بہت قریب رہا کرتے تھے۔ کسی وقت ان کا آپ کے بیت الخلا میں جانے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے آپ کے بیت الخلا میں بخاری شریف کو رکھا ہوا دیکھا۔ ایسے مقام پر بخاری شریف کا پایا جانا ان کے لئے نفرت کا سبب بن گیا اور وہ آپ سے دوری اختیار کر گئے اور ہمارے علمی حلقہ میں سبھی اس تعلق سے وضاحت چاہتے ہیں کہ کیا یہ ایک حقیقت ہے یا پھر آپ کی دشمنی میں ایک غلط بات اڑا دی گئی ہے؟۔ (محسن احمد، حیدرآباد)

جواب

یہ صحیح ہے کہ میرے مطالعہ کے کمرہ سے ملحق باتھ روم میں ایک الماری پر کچھ جلدیں رکھی ہوئی ہیں۔ مگر یہ جلدیں صحیح البخاری کی نہیں ہیں بلکہ وہ اخبار کی جلدیں ہیں اور جدید طرز کے ایک صاف ستھرے باتھ روم کی ایک الماری میں کسی اخبار کی جلدیں رکھنے میں یقینی طور پر کوئی حرج نہیں۔ صحیح البخاری میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(ایا کم الظن فان الظن اکذب الحدیث ، فتح الا وی بشرح النووی ۱۰/۴۹۶) یعنی تم لوگ گمان سے بچو کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ آپ کے دوست نے خود صحیح البخاری کی اس روایت پر عمل نہیں کیا۔ انھیں چاہئے تھا کہ باتھ روم میں رکھی ہوئی جلد کو کھول کر دیکھتے یا مجھ سے اس کی بابت پوچھتے۔ ایسا نہ کر کے انھوں نے صرف گمان کی بنیاد پر ایک بے بنیاد رائے قائم کی اور اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔ یہ صرف ایک غیر ذمہ دارانہ فعل ہے بلکہ وہ حدیث کے الفاظ میں ایک قسم کا کذب ہے۔

سوال

الرسالہ اکتوبر ۹۸ صفحہ ۴۳ پر قولی و فعلی دعوت کے جواب میں آپ نے فعلی دعوت کی نفی کی ہے۔ جب کہ قرآن سے فعلی دعوت ثابت ہے۔ مثال کے طور پر سورہ القلم کی یہ آیت **انک لعلی خلق عظیم**۔ (محسن احمد، حیدرآباد)

جواب

الرسالہ کی عبارت آپ نے غور سے نہیں پڑھی، ورنہ اس میں پوری بات موجود ہے۔ فعل بلاشبہ مطلوب ہے۔ مگر فعل یا کردار آدمی کی ذاتی ذمہ داری ہے نہ کہ دعوت کی شرط۔ آپ نے قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ تبلیغ کے لئے عمل نہیں ہے۔ عمل بلاشبہ ایک شخص کی لازمی ذمہ داری ہے اور اس کے ترک پر اس سے یقیناً باز پرس ہوگی۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ دعوت کا کام وہی شخص کرسکتا ہے جو پورے معنوں میں باعمل بن چکا ہو (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۱/۸۵)

سوال

دریائے سندھ کے اس پار جو لوگ بستے ہیں ان کو خود مسلم فاتحین نے ہندو کہا تھا۔ اس کے مطابق، ہمارا کہنا ہے کہ بھارت میں بسنے والے تمام لوگ ہندو ہیں۔ خواہ مذہب کے اعتبار سے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔ پھر آپ لوگ اپنے آپ کو ہندو کہلانے کو کیوں برا مانتے ہیں؟۔ (نشانت کمار، نئی دہلی)

جواب

ہندوستان یا بھارت اس وقت مسلم زیر حکومت نہیں ہے۔ آزادی کے بعد یہاں کا سیاسی اور سماجی نظام دستور ہند کے تحت چل رہا ہے۔ اس دستور میں اس ملک کے تمام باشندوں کو انڈین بتایا گیا ہے۔ چنانچہ پاسپورٹ وغیرہ میں اس ملک کا ہر رہنے والا اپنے آپ کو انڈین لکھتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ اس ملک کے تمام باشندوں کی نیشنلٹی ہندو ہے دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کے تمام بسنے والوں کو ہندو کہا جائے تو ان کو سب سے پہلے دستور میں ترمیم کر کے اس کی متعلقہ دفعات کو بدلنا چاہیئے۔ موجودہ حالت میں اس قسم کا مطالبہ کرنا دستور ہند کے خلاف ہے، اس لئے کسی کو ایسا کہنے کا حق ہی نہیں۔

سوال

حال ہی میں ہوئے بہار شریف میں فرقہ وارانہ ہندو مسلم فسادات کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندو 'درگا' کی مورتی لے کر مسلم محلّہ میں آ گئے اور اشتعال انگیز نعرہ لگانے لگے کہ مسلمان ہندوستان کے غدار ہیں۔ مسلمان پاکستانی ایجنٹ ہیں، ان کو ہندستان سے مار بھگاؤ۔ اس موقع پر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے تھا۔ (شاہ فیصل، ویاؤنالندہ)

جواب

اس سوال کا جواب پیشگی طور پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے دے دیا ہے۔ وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے: **امیتو الباطل با لصمت عنه** (باطل کو ہلاک کرو اس سے چپ رہ کر) مذکورہ قسم کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ان کے بارے میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اعراض سے یہ مسئلہ صرف دو منٹ کے نعرہ پر ختم ہو جاتا ہے اور جب اس طرح کے مواقع پر خاموشی کے بجائے جوابی اقدام کا طریقہ اختیار کریں تو غیر ضروری طور پر وہ برا انجام سامنے آ جاتا ہے جو بہار شریف اور بھاگلپور جیسے مقامات پر پیش آیا۔

سوال

جہاد کشمیر کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟۔ یہ کوئی اسلامی تحریک بھی ہے یا نہیں؟۔
(پیر محمد امین ترحگام، کشمیر)

جواب

میرے علم کے مطابق یہ اور اس قسم کی دوسری مسلح تحریکیں قومی لڑائی ہیں نہ کہ اسلامی جہاد۔ اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کوئی انفرادی یا جماعتی عمل نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر ریاست کا ایک عمل ہے۔ فقہ کا ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ: **الرحیل للامام** ۔ یعنی کسی قوم کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا حاکم کا کام ہے۔ اس قسم کی موجودہ جنگیں حکومتوں کی طرف سے نہیں لڑی جا رہی ہیں بلکہ انفرادی اشخاص بطور خود یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ مزید یہ کہ کوئی مسلم حکومت اگر اس قسم

کی کسی تحریک کو خفیہ مدد پہنچائے تو اس بنا پر وہ اسلامی جہاد نہیں ہو جائے گا۔ اس حکومت کو کھلے طور پر اس کا اعلان کرنا پڑے گا۔ اعلان کے بغیر خفیہ جنگ چھیڑنا بذات خود جائز نہیں۔

سوال

نفاذ اسلام کی تحریکیں موجودہ دور میں کیوں ناکام ہو رہی ہیں؟۔

(پیر محمد امین ترحگام، کشمیر)

جواب

اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی تحریک چلانے والے رہنما، ایک قدیم مثل کے مطابق، گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا چاہتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ سیاسی تحریک چلانے سے پہلے فکری تحریک چلائی جائے۔ لوگوں کی ذہنی اصلاح کر کے ان کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا کیا جائے اور جب لوگوں میں قبولیت کا مادہ پیدا ہو چکا ہو اس کے بعد قانون کا نفاذ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عرب میں یہی تدریجی طریقہ اختیار فرمایا۔ موجودہ زمانہ کا نام نہاد انقلابی طریقہ اسلامی طریقہ نہیں۔ وہ مارکس اور لینن کی تقلید ہے نہ کہ پیغمبر اسلام کی تقلید۔ موجودہ قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے نہ اسلامی قانون نافذ ہوا ہے اور نہ وہ آئندہ کبھی نافذ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اسلام کی خدمت نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ ہیں۔

سوال

اسلام کا پولیٹیکل سسٹم کیا ہے۔ اسلام میں ریاست کا ہیڈ کس طرح مقرر کیا جائے گا؟۔ اگر شوریٰ کے ذریعہ صدر ریاست کا انتخاب ہو تو اس انتخاب کا طریقہ کیا ہے۔ امریکہ کے مسلمانوں میں اس معاملہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو مسلمان جس ملک سے یہاں آئے ہیں وہ اپنے ہی ملک کے رائج اسلامی تعبیر کے مطابق اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح بات کیا ہے؟۔ (ڈاکٹر غنی خاں، میامی، امریکہ)

جواب

اس معاملہ میں اسلام میں کوئی واحد متعین طریقہ نہیں ہے۔ قرآن یا حدیث میں سیاسی معاملات کے بارے میں صرف بنیادی یا اساسی تعلیمات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام میں چار خلیفہ کو معیاری مانا گیا ہے۔ مگر چاروں کے معاملہ میں انتخاب کا طریقہ الگ الگ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاسی سسٹم کا معاملہ نماز جیسا نہیں ہے۔ نماز کا ایک معلوم اور متعین طریقہ ہے مگر ٹھیک اسی طرح سیاست کا کوئی واحد مقرر سسٹم نہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اسلام میں سیاسی معاملات کے بارے میں کافی آزادی دی گئی ہے۔ قرآن وحدیث سے سیاست کے بنیادی اصول کو لے کر ہم اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا آزادانہ نقشہ بنا سکتے ہیں۔ جب تک اسلام کی کسی تعلیم کی کھلی خلاف ورزی نہ ہو حالات کی مطابقت سے بنایا ہوا ہر ڈھانچہ اسلامی ڈھانچہ ہوگا۔

سوال

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف کتاب اس لئے لکھی کہ انھوں نے آپ کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن آپ نے بھی تو ایسا ہی کیا۔ آپ کے خلاف تنقیدیں چھپتی ہیں مگر آپ ان کا جواب نہیں دیتے۔ (محمد خالد ندوی، دہلی)

جواب

ایک صورت یہ ہے کہ معترض خط کی صورت میں براہ راست اپنا اعتراض لکھ کر بھیجے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنا اعتراض یا تنقید اخبار اور رسالے میں شائع کرے۔ علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ وہ براہ راست کئے گئے اعتراض کا جواب تو دیتے ہیں مگر چھپنے والے اعتراض کے بارے میں زیادہ تر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ میرا مسلک بھی یہی ہے۔ مولانا مودودی کو میں نے کتاب چھپنے سے پہلے اپنے اعتراض لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیجے تھے مگر اصرار کے باوجود انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس بنا پر دونوں معاملہ یکساں نہیں۔ خط کے ذریعہ موصول ہونے والے اعتراض کا جواب میں ہمیشہ دیتا ہوں۔ مگر چھپے ہوئے مضمون کا جواب صرف اس وقت دیتا ہوں جب کہ وہ سب وشتم نہ ہو بلکہ اس

میں واقعۃً کوئی قابل وضاحت نکتہ موجود ہو۔

سوال

میں نے کئی مذہبوں کو پڑھا ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ سب مذاہب ایک ہیں۔ سب مذاہب ایک ہی سچائی کی طرف جاتے ہیں۔ آج کل لوگوں میں یہ سوچ آ گئی ہے کہ میرا ہی مذہب اچھا اور سچا ہے۔ اس کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سب مذاہب یکساں ہیں تو تمام جھگڑے اپنے آپ مٹ جائیں گے۔ اس بارے میں آپ اپنی رائے دیں۔ (گوپال شرما، نئی دہلی)

جواب

سب مذاہب ایک ہیں کا نظریہ ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔ کیونکہ مذہبوں کے درمیان اختلاف ایک واضح حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں مخلوق کی علیحدگی کا تصور ہے، جب کہ ہندو دھرم میں دونوں کو ایک مانا جاتا ہے، اسی کا نام ادویت واد ہے۔ اسی طرح اسلام میں پیغمبر کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں خدائی اوتار کا تصور۔ اسلام میں موت کے بعد سزا اور جزا کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں آواگمن کا تصور، وغیرہ۔ جہاں تک سماجی اتحاد کا معاملہ ہے، اس کا کوئی تعلق مذہبی اتحاد سے نہیں۔ ساری تاریخ بتاتی ہے کہ بار بار ایک مذہب کے لوگ آپس میں لڑتے رہے ہیں مثلاً کوروا اور پانڈو دونوں ہندو تھے۔ اس کے باوجود ان میں زبردست جنگ ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں عیسائی قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی ۱۹۷۱ کی جنگ افغانستان کی موجودہ جنگ میں دونوں فریق مسلمان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اختلاف ایک فطری چیز ہے، وہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اختلاف انسانوں کے درمیان ہر حال میں باقی رہتا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اتحاد اور امن کی حقیقی بنیاد صرف ایک ہے، اور وہ ہے اسپرٹ آف ٹالرینس۔ ہمیں لوگوں کے اندر ٹالرینس اور باہمی احترام کا مزاج پیدا کرنا چاہیئے۔ نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ انسانوں کے درمیان اتحاد کا تعلق خود انسان کے اپنے مزاج سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی نظریہ سے۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں تشدد اور علیٰحدگی پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ملک میں منفی رول ادا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان مدرسوں کو باقی رکھنے کا کیا جواز ہے؟ (محمد عمران، راشٹریہ سہارا، دہلی)

جواب

یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں تشدد پسندی اور علیٰحدگی پسندی کا رجحان ہے مگر وہ زیادہ تر سیاسی لیڈروں کا پیدا کردہ ہے، ان کا مدرسوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان مدرسوں میں دین اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں میں ایسے لوگ تیار کئے جاتے ہیں جو اصول پسند اور با کردار ہوں اور اسی کے ساتھ وہ سماج میں مارل ٹیچر بن کر رہ سکیں۔ میں خود مدرسہ کے اسی تعلیمی نظام کا پیداوار ہوں اور میں پورے اعتماد کے ساتھ اس قسم کے الزام کی تردید کر سکتا ہوں۔ سیاست اور ٹی وی یہ دو چیزیں لوگوں کے کردار کو بری طرح تباہ کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں مدرسہ کے نظام کو مزید طاقتور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ موجودہ اخلاقی بگاڑ کے سیلاب کو روک سکیں۔

سوال

ھدایہ کا ایک جزئیہ ہے ''قتال الکفار واجب وان لم یبدونا'' (کفار سے قتال واجب ہے اگرچہ وہ ہم سے قتال کی ابتدا نہ کریں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان تعلق کی دائمی نسبت محاربہ کی ہے اور اہل کفر سے اہل ایمان کو جنگ کرنا مطلقاً واجب ہے۔ اسی طرح کی بات امام ابن القیم نے زاد المعاد میں جہاد کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے اور سید قطب شہید نے اپنی مشہور کتاب معالم فی الطریق میں اسی کو بنیاد بنا کر ایک لمبی بحث لکھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات علمی اور شرعی طور پر ثابت ہے؟۔ (غطریف شہباز ندوی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی)

جواب

دائمی محاربہ کا نظریہ نہ قرآن کی کسی براہ راست نص میں ہے اور نہ حدیث میں۔ وہ تمام تر کچھ فقہا اور علماء کے قیاس پر مبنی ہے اور دائمی محاربہ جیسا سنگین مسئلہ صرف نص صریح سے ثابت ہونا چاہیئے نہ کہ قیاس سے۔

مثال کے طور پر قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جب تک تم سے سیدھے (پرامن) رہیں تم بھی ان سے سیدھے (پرامن) رہو (التوبہ ۷) قرآن کی یہ آیت واضح طور پر مذکورہ نظریہ سے ٹکراتی ہے۔ اسی طرح ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو (لا تتمنوا لقاء العدو و اسالوا اللہ العافیۃ) یہ حدیث بھی واضح طور پر مذکورہ نظریہ کی تردید ہے۔ مزید یہ کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تم سے آسانی چاہتا ہے (البقرہ ۱۸۵) اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ دین آسان ہے (الدین یسر) مگر مذکورہ نظریہ دین کو نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک جدید مثال کمیونزم ہے۔ اس کو بھی ابدی محاربہ کے نظریہ پر قائم کیا گیا تھا مگر تقریباً سو سال کے تجربہ کے بعد وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ اگر ابدی محاربہ اسلام کا حکم ہو تو یہ نعوذ باللہ اسلام کو غیر ابدی قرار دینے کے ہم معنی ہوگا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے اس دنیا میں صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے..... ہلاکت یا منافقت۔ یعنی یا تو وہ ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں سے لڑ کر اپنے کو ہلاک کرتے رہیں یا ابدی محاربہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے ظاہری طور پر مصالحت کی روش اختیار کر لیں جس کا دوسرا نام منافقت ہے۔

سوال

آپ نے اپنی متعدد تحریروں میں تقسیم ہند کو ایک غلط فیصلہ قرار دیا ہے۔ آپ کے نزدیک تقسیم ہند کی تحریک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ مطلوب دعوتی تعلق کو نقصان پہنچایا ہے۔ دونوں قومیں اسی تحریک کے باعث ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں۔ ہم یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے پچاس سال بعد اس بحث کا فائدہ کیا ہے۔ کیا تاریخ کے پہیہ کو الٹا گھمایا جا سکتا ہے؟۔ (طالب محسن، لاہور)

جواب

پاکستان کے بیشتر لکھنے اور بولنے والے بنگلہ دیش پر اور بنگلہ دیش کی قیادت پر تنقید کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ بنگلہ دیش کے معاملہ میں "تاریخ کے پہیے کو الٹا گھمایا جائے"۔ اس قسم کی تنقیدوں کا مقصد صرف اس ذہنیت پر تنقید ہوتا ہے جس نے بنگلہ دیش کو بنوایا۔ اسی طرح پاکستان کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا

مقصد بھی تقسیم اور تفریق کی ذہنیت پر تنقید ہے نہ کہ تاریخی معنوں میں وجود پاکستان پر تنقید۔ آج یہ صورت حال ہے کہ دنیا کے جس ملک میں بھی مسلمان اس کے کسی خطہ میں اکثریت رکھتے ہیں وہاں وہ مرکزی لیڈرشپ سے ٹکراؤ کر کے اپنا علیٰحدہ مسلم پاکٹ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ذہنیت میرے نزدیک اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام پھیلاؤ کو پسند کرتا ہے نہ کہ سمٹنے کو۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی قوموں کو خدا کے سایۂ رحمت میں لایا جائے نہ کہ ان کو غیر قوم قرار دے کر ان سے جدائی اختیار کر لی جائے۔

سوال

مسلمانوں کے اندر باہمی مسلکی جھگڑے کیا اپنی جہالت کی وجہ سے ہیں یا اس کے لئے غیر قوموں کی طرف سے ہوا دی جاتی ہے۔ یعنی یہ صورت حال مسلمانوں کی کسی داخلی کمزوری کا نتیجہ ہے یا وہ اغیار کی سازش کا نتیجہ ہے؟۔ (عبدالملک المظاہری، حیدرآباد)

جواب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے اوپر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰) اس کے مطابق ہمیں ہر مصیبت یا افتاد کا سبب خود اپنی کمزوریوں کو سمجھنا چاہیئے نہ کہ اغیار کی مخالفانہ کارروائیوں کا نتیجہ۔ یہ دنیا مسابقت کی دنیا ہے، اس لئے یہاں مسلمانوں کے خلاف سازشیں بھی ضرور ہوں گی۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اس کا حل دوسروں سے لڑنا نہیں ہے بلکہ اس کا حل قرآن کے مطابق، یہ ہے کہ خود اپنے اندر تقویٰ اور صبر کی طاقت پیدا کی جائے۔ صبر اور تقویٰ ہر سازش کے خلاف یقینی ڈھال ہے (آل عمران ۱۲۰)

سوال

آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ آپ شعوری یا لاشعوری طور پر تصوف کے نظریہ وحدت شہود کے قائل ہیں۔ کیا آپ غیر مسلموں کو اسلام کے قریب لانے کے لئے اس نظریہ کی وقتی ضرورت اور مصلحت کے تحت قائل ہیں یا یہ کہ باقاعدہ اسے ایک ابدی نظریہ اور حقیقت سمجھتے ہیں؟۔ (محمد اورنگ زیب صالح، اوکاڑی، پاکستان)

جواب

وحدت وجود اور وحدت شہود دونوں ہی نظریہ کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی تحریروں میں ان کی تائید نہیں کی، نہ وقتی اور نہ مستقل۔ یہ دونوں نظریات لفظی فرق کے باوجود حقیقۃً ایک ہیں۔ وحدت وجود کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ تمام موجودات خدا کا جزٔ ہیں، اور وحدت شہود کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات خدا کا مظہر ہیں۔ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو خدا نے اپنے حکم سے پیدا کیا ہے۔ خالق الگ ہے اور مخلوق الگ۔ دونوں کے درمیان کوئی وجودی اشتراک نہیں۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں اور آپ جو کام کر رہے ہیں اس کا قدرداں ہوں۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں رسالہ اور کتاب کے ذریعہ ان لوگوں تک دعوت نہیں پہنچائی جاسکتی۔ ہمیں ایسی کوئی ترکیب عمل میں لانا چاہیئے کہ ایسے لوگوں تک بھی دعوت کا پیغام پہنچ سکے۔ (سید عبد الحفیظ، بھڑگاؤں، جل گاؤں)

جواب

ہر زمانہ کی طرح آج بھی مسلمانوں میں خواص اور عوام دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت دونوں ہی طبقوں میں اسلامی دعوت کا کام جاری ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، تبلیغی جماعت ان کے درمیان وسیع اور موثر کام کر رہی ہے اور ماشاء اللہ اس کے مثبت نتائج بھی نکل رہے ہیں۔ ہم نے اصلاً خواص کے طبقہ کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ پچھلے پچیس سال کی کوشش کے نتیجہ میں آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواص کے طبقہ میں اسلام کا پیغام وسیع پیمانہ پر پہنچ رہا ہے اور اس کے مثبت نتائج بھی واضح طور پر نکل رہے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجہ میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں لوگوں کو از سر نو اسلام کی صداقت پر یقین حاصل ہوا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے ہندوستان کے مسلمانوں میں احتجاج اور ٹکراؤ کا مزاج بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ تعلیم اور تجارت جیسے تعمیری شعبوں میں سرگرم ہو رہے ہیں۔ یہ بھی

سب سے زیادہ الرسالہ تحریک کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ تحریک اگرچہ براہ راست طور پر تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچی ہے مگر یہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے اپنے حلقہ میں عوام تک بھی اس تعمیری آواز کو پہنچانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

سوال

ماہنامہ الرسالہ کا میں ایک ریگولر ریڈر ہوں اور اس کو پسند کرتا ہوں، مگر کبھی کبھی آپ نزاعی معاملات میں پڑ جاتے ہیں جو آپ کو نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً بابری مسجد، وندے ماترم جیسے اشو میں پڑ کر آپ نے اپنے کو متنازعہ شخصیت بنالیا۔ یہ آپ کے مثبت مشن کے لئے مفید نہیں

(شفیع الدین احمد، دہلی)

جواب

کوئی بھی شخص جو اجتماعی تحریک چلائے۔ اس کے لئے نزاع سے بچنا ممکن نہیں۔ نزاع آپ کے اندر نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسروں کے دماغ میں ہوتی ہے اور وہ اس کو آپ کے ساتھ منسوب کر کے غیر ضروری طور پر نزاعی بنا دیتے ہیں۔ کوئی شخص کتنا ہی محتاط ہو، وہ ایسے لوگوں کے زبان وقلم سے بچ نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر سید ابوالحسن علی ندوی اپنی اعتدال پسندی اور غیر اختلافی روش کے لئے مشہور ہیں۔ مگر ان کے بارے میں بھی متعدد بار اخبار میں اس قسم کی باتیں آتی رہی ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہفت روزہ نئی دنیا (دہلی) کے شمارہ ۱۔۷ دسمبر ۱۹۹۸ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک مسلم رہنما مولانا موصوف کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے کیا مطلب نکالا جائے کہ مولانا علی میاں اندر ہی اندر سازش کر رہے ہیں اور ایسے بیانات دے کر بی جے پی کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں..... اور یہ کہ مولانا علی میاں اس سازش کو سمجھنے میں ناکام رہے اور مسلمانوں کو غلط مشورہ دے دیا ہے جس کی میں مکمل طور پر مخالفت کرتا ہوں..... مولانا علی میاں کا بیان بی جے پی کے مقصد کو پورا کر دے گا..... میں مولانا علی میاں کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا ہوں کیونکہ اس سے وشو ہندو پریشد اور بی جے پی کی مسلمانوں کو تعلیم سے دور کرنے کی سازش کامیاب ہو جائے گی..... میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی

(صفحہ۵) اسی صورت حال کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کہا تھا۔

قیل ان الرسول قد کھنا　　قیل انا لالہ ذو ولد

من لسان الوریٰ فکیف انا　　مانجا اللہ والرسول معاً

جہاں تک متنازعہ شخصیت کا تعلق ہے تو یہ سراسر ایک اضافی بات ہے۔ تاریخ کے تمام بڑے رہنما اپنے زمانے میں متنازعہ شخصیت تھے اور بعد کے زمانہ میں مسلّمہ شخصیت۔ ابوحنیفہ، فخر الدین الرازی، ابن تیمیہ اپنے معاصرین کی نظر میں متنازعہ شخصیت تھے۔ مگر بعد والوں کی نظر میں وہ امام بن گئے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، سرسید، سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اپنے زمانہ میں متنازعہ شخصیت بن گئے تھے۔ معاصرین کی نظر میں متنازعہ شخصیت بننا اس بات کی پیشگی اطلاع ہے کہ مستقبل میں اس کو یقینی طور پر غیر متنازعہ شخصیت کا مقام ملنے والا ہے۔

سوال

خدا کے وجود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو کائنات کو کون پیدا کرتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خدا کائنات کو پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا؟ (خوشونت سنگھ، دہلی)

جواب

یہ ایک غلط قیاس ہے۔ موجودہ زمانہ میں کائنات کے سائنسی مطالعہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کائنات خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کرسکتی۔ ضرورت ہے کہ کائنات کے باہر اس کا کوئی موجد یا خالق پایا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر بگ بینگ کا نظریہ یہی بتاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، کائنات ایک خارجی دھماکہ سے وجود میں آئی ہے۔ علمی اور عقلی طور پر دیکھا جائے تو ایسی حالت میں ہمارے لئے انتخاب (choice) باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجد کائنات میں ہے۔ چونکہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کو موجود مانیں۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو بھی مانیں۔ خدا کے وجود کو مان کر ہم کائنات کے وجود کی توجیہہ پالیتے ہیں۔ جب کہ خدا کے وجود کو نہ ماننے کی صورت میں خود کائنات بلا توجیہہ رہ جاتی ہے اور علمی طور پر یہ توجیہ قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

سوال

آپ دعوتی نقطۂ نظر سے ایک کام کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلم دشمن عناصر کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً جا بجا مسلمانوں کی خامیوں کا ذکر کرنا وغیرہ۔ اس سے انھیں موقع ملتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مطعون کر سکیں۔ آپ کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ (محمد خالد ندوی، دہلی)

جواب

الرسالہ کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ اسی لئے میں الرسالہ کو ایک نصیحت نامہ کہتا ہوں۔ نصیحت کا یا اصلاح کا طریقہ کیا ہے اس کو جاننے کا واحد ذریعہ قرآن ہے۔ نصیحت یا اصلاح کے بارے میں قرآن کا جو اسلوب ہے وہی اسلوب میں اختیار کیا ہے اور قرآن کا اسلوب اس معاملہ میں یہی ہے کہ جہاں کوئی داخلی کوتاہی نظر آئے اس کو کھلے طور پر ظاہر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مذکورہ قسم کے اندیشے کا لحاظ کرنا قرآنی اسلوب کے سراسر خلاف ہے اور اسی لئے بے فائدہ بھی۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے بعد دشمنوں کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ چند صحابہ (حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ) کی رائے یہ تھی کہ ان کے جنگی جرم کی بنا پر انھیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن اکثر صحابہ بشمول حضرت ابوبکرؓ اور خود رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ ہوئی کہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اترا اور فرمایا کہ..... تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ چاہتا ہے آخرت (الانفال ۶۷) یہ آیت بظاہر یہ بتاتی ہے کہ صحابہ کی اکثریت خدانخواستہ حب مال میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اگر نصیحت کا مذکورہ معیار درست ہو تو قرآن کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا اس طرح اظہار نہیں کرنا چاہیئے تھا کیوں کہ اس طرح اغیار کو یہ کہنے کا موقع مل رہا تھا کہ ہم لوگوں کی ساری جدوجہد مال کے لئے ہے۔ اس اندیشہ کے باوجود قرآن میں مذکورہ تنبیہ نازل کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے مطابق نصیحت کے معاملہ میں مذکورہ قسم کا اندیشہ سراسر غیر معتبر ہے۔ اس معاملہ میں حقیقت حال کو جیسا ہے ویسا ہی بیان کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اخفا کا طریقہ اختیار کرنا اگر مطلوب ہوتا تو قرآن

میں مذکورہ آیت ہرگز نازل نہ ہوتی (اس طرح کی کئی اور مثالیں قرآن میں موجود ہیں)

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام کی پرامن تبلیغ ہونی چاہیئے۔ مگر نبیوں کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہر نبی کو وقت کے اقتدار سے سنگھرش کرنا پڑا۔ ہمیشہ حق کو باطل سے مقابلہ آرائی کرنا پڑا اس لئے پرامن تبلیغ کس طرح ہوسکتی ہے؟۔ (شکیل احمد، ورورہ مہاراشٹر)

جواب

ہر نبی نے اقتدار کے خلاف جنگ کی..... یہ خودساختہ مفروضہ ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ جنگ کا تعلق دعوت سے نہیں بلکہ دفاع سے ہے۔ ناگزیر حالات میں حسب استطاعت دفاع کیا جاتا ہے۔ کسی نبی کی تاریخ میں اگر جنگ کا واقعہ پیش آیا تو وہ جارحیت کے خلاف دفاع کے لئے، اپنے پیغام کی اشاعت کے لئے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبر کا اپنے ہم عصر لوگوں سے جو ٹکراؤ پیش آیا وہ ایک زمانی چیز تھی۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا اس لئے ہر مذہب کے مقابلہ میں تشدد کا تجربہ پیش آتا ہے۔ مگر اب آزادیِ فکر کا زمانہ ہے۔ اب اظہار رائے کی آزادی کو ہر انسان کا لازمی حق سمجھا جاتا ہے اس لئے اب اگر صحیح اسلوب میں دعوت کیا جائے تو عملاً تشددانہ ردِعمل پیش آنے کا کوئی امکان نہیں۔

سوال

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **کان حقا علینا نصر المومنین** (الروم ۴۷) اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الھند نے اس طرح کیا ہے کہ: اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل اوقات میں خدا ضرور اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ حتی کہ وہ اس کو اپنے اوپر اہل ایمان کا حق سمجھتا ہے۔ مگر ہم سیکھتے ہیں پچھلی کئی نسلوں سے مسلمان تقریباً ساری دنیا میں اغیار کی زیادتیوں کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں مگر ان پر خدا کی وہ مدد نہیں آتی جو زیادتیوں کا یہ سلسلہ ختم کردے اور مسلمانوں کو دوبارہ سربلند کردے اور اس طرح ہمارے اوپر خدا کا وعدہ پورا ہو۔ (عبدالرحیم امدادی، مرشدآباد)

جواب

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلا شبہ برحق ہے۔مگر اس آیت میں مومنین کے لفظ سے مراد عمومی مفہوم میں مسلم ملت یا مسلم قوم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو خدا کے اس مطلوب مشن کو لے کر اٹھیں جس کو رسول اللہ کے زمانہ کے اہل ایمان لے کر اٹھے تھے اور اس میں اپنی جان و مال کی قربانی دی تھی۔ جب اہل ایمان کا کوئی گروہ اس قسم کا ربّانی مشن لے کر اٹھے اور کچھ لوگ اس کو چیلنج کریں تو ان کا یہ چیلنج خود خدا کے خلاف چیلنج کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مخالفانہ کاروائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کے خلاف ہوتی ہے نہ کہ محض اہل ایمان کے خلاف۔ یہی وجہ ہے کہ خدا ایسے اہل ایمان کی مدد پر آجاتا ہے۔موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی ان مقابلہ آرائیوں میں خواہ اسلام کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے، ہر حال میں وہ مسلمانوں کی اپنی قومی یا سیاسی لڑائیاں ہیں۔ خدا کا مذکورہ وعدہ موجودہ قسم کی قومی لڑائیوں پر نہیں ہے بلکہ وہ اصحاب رسول جیسی خالص دینی جدوجہد کے اوپر ہے۔ یہ معاملہ قرآن کی آیتوں میں بالکل واضح ہے مثال کے طور پر فرمایا کہ ''ان تنصروا الله ينصركم '' (محمد۔۸) یعنی اگر تم اللہ والا کام کرنے کے لئے اٹھو گے تو اللہ تمہاری مدد کر کے تم کو کامیاب بنائے گا۔اس سے واضح ہے کہ مدد کا وعدہ اللہ والے کام پر ہے نہ کہ مسلمانوں کے اپنے قومی کاموں پر۔

سوال

کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ ہندوؤں ہی کی طرح انگریز بھی ہمارے مدعو تھے۔ آخر ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کی تحریک کس دعوتی جذنے کے تحت درست قرار دی جاسکتی ہے۔ غالباً آپ اس پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ یہ ایک ناگزیر تاریخی عمل تھا۔میرے نزدیک یہی اصول تحریک پاکستان کے معاملہ میں بھی کارفرما ہے۔(طالب محسن، لاہور)

جواب

ہندوستان میں ملکی آزادی کی جو تحریک چلائی گئی اس میں اگرچہ علماء بڑی تعداد میں شریک

تھے۔مگر میں اس کو کوئی اسلامی تحریک نہیں سمجھتا اور نہ اس کے لئے جہادِ آزادی کے لفظ کا استعمال شرعاً درست سمجھتا ہوں۔ یہ بات میں نے بار بار الرسالہ میں اور اپنی کتابوں میں لکھی ہے۔ میرے نزدیک آزادی کی یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی اور اسی اعتبار سے اس کا جواز ہے۔ اگر پاکستان کی تحریک کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ وہ ایک قومی تحریک تھی نہ کہ کوئی اسلامی تحریک تو اس کے بارے میں بھی میری رائے مختلف ہو جائیگی۔ میں نے بار بار لکھا ہے کہ جن علماء نے انگریزوں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریک چلائی انھیں انگریزوں کے معاملہ میں دعوتی تحریک چلانا چاہیئے تھا۔ اسی طرح جن مسلم رہنماؤں نے ہندو مسئلہ کے خلاف علیحدہ پاکستان کی تحریک چلائی، ان کے لئے بھی زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں دعوت کی تحریک چلاتے۔ میری ایک ہی رائے دونوں قسم کے مسلم رہنماؤں کے بارے میں ہے۔

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ مگر قرآن میں اس کا بالکل الٹا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ ان کو مارو۔ قرآن اسلام کی مقدس کتاب ہے۔ پھر اسلام امن کا مذہب کیسے ہوسکتا ہے؟ (بیکنٹھ لال شرما پریم، نئی دہلی)

جواب

قرآن میں جہاں قاتلوالمشرکین کا حکم آیا ہے، وہ عام معنی میں نہیں ہے، بلکہ خاص معنی میں ہے۔ اس سے مراد ساری دنیا اور ہر زمانہ کے مشرکین نہیں بلکہ پیغمبر اسلام کے معاصر مشرکین ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو پیغمبر اسلام کے خلاف جارحیت کر رہے تھے۔ جنھوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر جنگ چھیڑ دی تھی۔ ان سے دفاع کے طور پر لڑنے کا حکم دیا گیا۔

اسلام میں صرف ایک ہی جائز جنگ ہے اور وہ دفاع کی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی اور جنگ اسلام میں جائز نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''فکر اسلامی'')

قرآن میں قتال کے حکم کو آپ گیتا کے تقابلی مقابلہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ گیتا ہندوؤں کی ایک

مقدس کتاب ہے۔ اس میں کرشن جی ارجن کو لڑنے پر ابھارتے ہیں۔ وہ ارجن سے کہتے ہیں کہ تم یدھ کے لئے آگے بڑھو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ گیتا اپنے ماننے والوں سے کہتی ہے کہ تم لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ دوسری قوموں سے لڑتے رہو۔ تم ہر ایک کے خلاف مار کاٹ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ گیتا میں کرشن جی کی جنگی تلقین وقتی معنی میں ہے نہ کہ ابدی معنی میں۔ یعنی تمہارے سامنے جو اپنائی لوگ ہیں ان سے لڑو۔ انھیں پر یہ جنگ ہوئی اور انھیں پر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ پیغمبر کے زمانے کے ایک جارح گروہ کے خلاف تھی۔ یہ جنگ انھیں پر شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہوگئی۔ بعد کے زمانہ میں اس کا حکم اگر باقی ہے تو صرف جارحیت کرنے والوں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے ہے نہ کہ عمومی طور پر لوگوں سے لڑنے مرنے کے لئے۔

سوال

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اخلاص میں برکت ہے۔ جو کام اخلاص کے بغیر کیا جائے اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں (شاہ فیصل، دہلی)

جواب

یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ حقیقت ہے۔ اس کو مذہب کی زبان میں کہنا ہو تو یہ کہیں گے کہ اخلاص میں برکت ہوتی ہے اور فطرت کی زبان میں کہنا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ تاثیر صرف اس کام میں ہے جس کو انسانی درد کے ساتھ کیا گیا ہو۔ پروفیشنل طور پر کئے گئے کام میں کوئی تاثیر نہیں ہو سکتی۔ برکت یا تاثیر کا تعلق صرف بات سے نہیں ہے بلکہ اس سے ہے کہ بات کو کس طرح کہا گیا ہے۔ ایک پیشہ ور گیت کار مترنم لہجہ میں اخلاق اور محبت کا گیت گائے تو سننے والے اس سے وقتی لطف لے سکتے ہیں مگر اس کا یہ نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ سننے والے اپنی عملی زندگیوں میں غیر اخلاقی روش کو چھوڑ دیں اور اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی میں اختیار کر لیں۔ کیوں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ یہ آدمی ذاتی مفاد کے لئے ایسا کر رہا ہے نہ کہ حقیقتاً اصلاح انسانیت کے لئے۔ اس کے برعکس با مقصد اور دردمند آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ صبح و شام اس لئے تڑپ رہا ہوتا ہے کہ لوگ بے

اخلاقی کا طریقہ چھوڑ دیں اور با اخلاق زندگی اختیار کریں۔ وہ اپنی تنہائیوں میں لوگوں کی اصلاح کے لئے دعائیں کرتا ہے۔ وہ رات دن سوچتا ہے کہ بات کو کس طرح زیادہ بہتر انداز میں کہے جو لوگوں آنسوؤں سے بنی ہوئی سیاہی کے لئے موثر ہو سکے۔ اخلاق اور روحانیت اس کے لئے صرف کہنے کی بات نہیں ہوتی بلکہ وہ عملؐ کرنے کی بات ہوتی ہے۔ وہ اس کو جنت اور جہنم کا مسئلہ سمجھتا ہے، اس لئے دوسروں کو سنانے سے پہلے وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔ وہ کہنے سے پہلے کرنے والا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا کہنا صرف کہنا نہیں ہوتا بلکہ اپنے دل کے درد کو انڈیلنا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اور بولنا صرف لکھنا اور بولنا نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس کا پورا وجود شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے قلم کی سیاہی بازار کی سیاہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ہوتی ہے۔ اس کی آواز ہوا کی لہروں پر سفر نہیں کرتی بلکہ وہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک روح سے نکل کر دوسری روح تک پہنچتی ہے۔ اسی کا نام اخلاص ہے اور جو بات اس اخلاص کے ساتھ نکلے وہ از دل خیزو بر دل ریز د کی مصداق ہوتی ہے، الّا یہ کہ سننے والا ایک ایسا انسان ہو جس کے سینہ میں بدقسمتی سے دل ہی نہ ہو، ایسا آدمی پتھر کا ایک مجسمہ ہوگا نہ کہ حقیقۃً کوئی زندہ انسان۔

سوال

میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اکثر آپ کے خلاف بولتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان میں بولتے ہیں۔ وہ شوشے نکال کر آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ لوگ دلیل کی زبان میں آپ کی کاٹ کریں یا قرآن وحدیث کے حوالوں سے آپ کی بات رد کریں۔ آخر اس روش کے پیچھے نفسیات کیا ہے۔ یہ لوگ کیوں ایسا کرتے ہیں جب کہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی باتوں سے نہ آپ کی تردید ہوتی ہے اور نہ کوئی ان سے متاثر ہو سکتا ہے۔

(ڈاکٹر انوار الحق، اعظم گڈھ)

جواب

اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ آپ کے پاس اپنے حریف کے لئے اگر بم ہو تو آپ اس کے اوپر بم ماریں گے، آپ اس کی طرف کنکری نہیں پھینکیں گے۔ البتہ اگر آپ محسوس کریں کہ میرے

پاس اپنے حریف کے خلاف کوئی طاقت ور ہتھیار نہیں تو دل کا بخار نکالنے کے لئے آپ اس کو گالیاں دیں گے۔ کنکری پھینک کر یہ تسکین حاصل کریں گے کہ آپ نے اس کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ جو لوگ میرے خلاف عیب زنی اور الزام تراشی کی مہم چلا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ دلائل کے اعتبار سے وہ بالکل بے بس ہیں۔ یہ الرسالہ کا ہر قاری جانتا ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں ہمیشہ قرآن وحدیث کے حوالوں کی روشنی لکھتا ہوں۔ ایسی حالت میں جو لوگ میرے خلاف عیب جوئی اور الزام تراشی کا طریقہ اختیار کریں انھوں نے صرف مجھ کو نشانہ نہیں بنایا۔ انھوں نے قرآنی دعوت کو رد کیا۔ انھوں نے اپنی زبان حال سے یہ کہا کہ ہم کو قرآن وحدیث سے کوئی مطلب نہیں، ہم کو صرف اپنے تعصّبات سے مطلب ہے۔ بظاہر اگرچہ وہ مجھ کو برا بھلا کہتے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں سرکشی کر رہے ہیں۔ وہ نعوذ باللہ خدا اور رسول کی ناقدری کرنے کے مجرم بن رہے ہیں۔ ان حضرات کی یہ روش اپنی حقیقت کے اعتبار سے قرآن کے اس ارشاد کی مصداق ہے ''یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کر رہے ہیں'' (الانعام ۳۳)

سوال

کچھ مسلمانوں کو آپ سے جو شکایت ہے، وہ اس وقت شروع ہوئی، جب آپ آر ایس ایس اور کٹر ہندوؤں کے جلسوں میں جانے لگے۔ مسلمان عام طور پر ان کو مسلم دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب آپ ان کے جلسوں میں جانے لگے تو کچھ لوگوں کو آپ کے بارے میں شبہ ہوا کہ آپ خدا نخواستہ ان کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ یہ سوال ان مسلمانوں کے ذہن میں بھی ہے جو اسلام کے بارے میں آپ کی تحریروں کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

(عمران احمد اصلاحی، دہلی)

جواب

اس معاملہ میں لوگوں کا شبہہ بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ تو میں ایک بھولی ہوئی سنت کو زندہ کر

رہا ہوں ۔ رسول اللہ ﷺ کافروں اور مشرکوں کی مجلسوں میں اور ان کے میلوں اور بازاروں میں جاتے تھے تاکہ انھیں اسلام کا پیغام پہنچائیں ۔ یہ لوگ خود اپنے اجتماعات ہی میں بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں، کسی اور جگہ ہم ان کو نہیں پا سکتے ۔ اس لئے ان کو عمومی طور اسلام سے متعارف کرنے کی واحد صورت یہی ہے کہ خود ان کے اجتماعات میں شرکت کی جائے ۔ آر ایس ایس کے لوگ میرے اس مقصد کو بخوبی جانتے ہیں ۔ چنانچہ آر ایس ایس کے انگریزی (ہفت روزہ آرگنائزر، دہلی) نے میرے بارے میں دو قسطوں میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا : ایک مبلغ مولانا (A Missionary Maulana) آر ایس ایس کے ایک لیڈر ڈاکٹر چندر شرما نے ہندی اخبار راجستھان پتریکا میں میرے بارہ میں ایک مضمون شائع کیا جس میں انھوں نے لکھا کہ دوسرے مسلمانوں کا طریقہ عداوت کا ہے اور مولانا کا طریقہ دعوت کا ۔ دہلی کے فکی آڈیٹوریم میں ایک جلسہ ہوا ۔ یہ جلسہ دہلی کے آر ایس ایس حلقہ کی طرف سے کیا گیا تھا ۔ اس میں صرف دو مقرر تھے ۔ ایک میں اور دوسرے جناب اٹل بہاری واجپئی ۔ میں نے اپنی تقریر کا موضوع وما ارسلناک الا رحمة للعالمین بنایا اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی پوری تقریر اسلام کے تعارف پر کی ۔ اس کے بعد جناب اٹل بہاری واجپئی اسٹیج پر آئے ۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی اور شروع ہی میں مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : مولانا صاحب، یہ وچار منچ ہے، یہ پرچار منچ نہیں ہے ۔ اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ میں ''کٹر ہندوؤں'' کے جلسوں میں جاتا ہوں تو وہاں میں اپنی تقریر میں کیا بات کہتا ہوں ۔ جو لوگ پابندی کے ساتھ ماہنامہ الرسالہ پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ میری زندگی کا واحد مشن دعوت ہے ۔ اسلام کے پیغام رحمت کو تمام قوموں تک پہنچانا ۔ اسی کو میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے ۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ میں مسلسل یہی کام کر رہا ہوں ۔ آر ایس ایس کے جلسوں میں جانا بھی اسی سلسلہ تعارف کی ایک کڑی ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانے میں اسلام اجنبی ہو جائے گا ۔ موجودہ زمانے میں چونکہ غیر مسلموں میں جا کر انھیں اسلام کا پیغام پہونچانے کا کام تقریباً ختم ہو گیا ہے اسلئے کچھ لوگ اس کو اجنبیت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ مگر

مجھے یہ یقین ہے کہ میرا یہ عمل ایک عبادت ہے۔ میں اللہ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میرا یہ کام انشاءاللہ اس مخصوص دینی عمل میں شمار کیا جائے گا جس کو حدیث میں مردہ سنت کو زندہ کرنے کا نام دیا گیا ہے۔ رواجی دین پر عمل کرنے والا فوراً لوگوں کی نظر میں مقبول بن جاتا ہے۔ لیکن متروک دین پر عمل کرنے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دین کے متروک جزء پر عمل ہمیشہ نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ..... ان عظم الجزاء مع عظم البلاء (الترمذی، کتاب الزھد)

سوال

آج کل ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ہی نقصان میں رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟۔ کہا جاتا ہے کہ ہم کو مسلمان ہونے کی سزا دی جارہی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمان ہونے کی بنا پر ہمارے خلاف یہ زیادتیاں کی جارہی ہیں؟۔ (نسیم علی خان، بمبئی)

جواب

قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ دور اول کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم (الشوریٰ ۳۰) یعنی جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس آیت کے مطابق، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب کسی مسئلہ سے دوچار ہو تو وہ مفروضہ دشمنوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی شکایت کرنے لگے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص مستقل طور پر کسی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کمزوری دوسروں کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اس کو اپنی ظالمانہ کاروائیوں کا نشانہ بنائے۔ جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے تو قرآن میں بار بار یہ ضمانت دی گئی ہے کہ اہل ایمان اگر صحیح معنوں میں دینی روش پر قائم ہوں تو وہ کبھی بھی اغیار کے ظلم یا سازش کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ اس سلسلہ میں قرآن سے چند حوالے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، مثلاً قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: تم

ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو (آل عمران ۱۳۹) اسی طرح فرمایا: اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں کے اوپر کوئی راہ نہیں دے گا (النساء ۱۴۱) مزید فرمایا کہ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) قرآن کے ان ارشادات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب بھی اغیار کے ظلم و زیادتی کے شکار ہوں تو ہمیشہ اس کا سبب خود مسلمانوں کے اندر ہوگا نہ کہ مسلمانوں کے باہر۔ اس اصول کی عملی مثال یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو جب احد کی جنگ میں جان و مال کا سخت نقصان پیش آیا تو قرآن میں اس کا سبب خود مسلمانوں کے باہمی نزاع کو قرار دیا گیا (آل عمران ۱۵۲) اسی طرح حنین کی جنگ میں ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو اس کا سبب بھی قرآن میں خود مسلمانوں کے عجب کو قرار دیا گیا (التوبہ ۲۵) قرآن کے یہ ارشادات واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ایسے معاملات میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ ہم دشمنوں کی سازش کا انکشاف کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور نہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف منفی کاروائیوں میں لگ جائیں۔ اس کے برعکس ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ ہم خود اپنا احتساب کریں۔ ہم اپنی داخلی کمزوریوں کو تلاش کر کے ان کی اصلاح کریں۔ یہی اس معاملہ میں قرآنی ذہن ہے اور اس معاملہ کا قرآنی حل۔

سوال

آپ نے اپنی کتاب ''اسلام دور جدید کا خالق'' اور دوسرے کئی مضامین میں یہ لکھا ہے کہ جدید دور کی ترقیوں کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان ترقیوں کے لئے مسلمانوں کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟۔ کیا ایسا تعصب کی بنا پر ہے؟۔

(عمران احمد اصلاحی، دہلی)

جواب

یہ کوئی تعصب کا معاملہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک سادہ فطری معاملہ ہے۔ ہر گھر میں اور ہر سماج میں آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی کو جو عزت ملتی ہے وہ اس کے کارناموں کی بنیاد پر ملتی ہے نہ کہ ماضی کے

کارناموں کی بنیاد پر۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید ترقیاتی دور کا آغاز کیا۔ لیکن اگلے مرحلے میں وہ زوال کا شکار ہو گئے۔ اگلے مرحلے کے تمام کام مغربی قوموں نے انجام دئے۔ اس لئے ہر طرف انھیں کا نام لیا جانے لگا۔ مثلاً ہزاروں سال سے انسان دریاؤں کو معبود کا درجہ دے کر ان کی پرستش میں مبتلا تھا۔ مسلمانوں نے یہ کام کیا کہ دریاؤں کو معبودیت کے درجہ سے ہٹایا۔ مگر پانی کو اسٹیم پاور میں بدلنے کا کام اہل مغرب نے انجام دیا نہ کہ مسلانوں نے۔ اسی طرح دنیا آفتاب پرستی میں مبتلا تھی۔ مسلمانوں نے انسان کو آفتاب پرستی کی ذلت سے نکالا۔ مگر آفتاب کو سولر انرجی میں تبدیل کرنے کا کام تمام تر اہل مغرب نے انجام دیا وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا نام ماضی کی تاریخ میں تو ضرور لکھا ہوا ہے مگر حال کی دنیا میں ان کا کوئی چرچا نہیں۔ یہی معاملہ تمام ترقیات کا ہے۔ جن چیزوں کو تمدنی ترقی کہا جاتا ہے وہ سب فطرت کے اندر چھپی ہوئی طاقتوں کو دریافت کر کے ان کو استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ قدیم زمانے کا انسان فطرت کو معبود کا درجہ دیئے ہوئے تھا۔ اس بنا پر اس کے اندر فطرت کی تسخیر کا ذہن پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اہل اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو معبود کے بجائے مخلوق کا درجہ عطا کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ تاریخ میں پہلی بار فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کی تسخیر کا عمل شروع ہو گیا۔ اسی کا براہ راست نتیجہ وہ تمام ترقیاں ہیں جو آج دنیا میں نظر آتی ہیں۔

سوال

اسلام کے معاشی نظریات جو شروع کے دور میں نافذ کئے گئے تھے کیا وہ نظام آج کے دور میں کامیاب ہوسکتا ہے؟ جبکہ ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا رواج ہے۔ مختصراً یہ کہ آپ اسلام کے معاشی نظریات کو عصری اسلوب میں کس طرح پیش کریں گے؟۔ (ڈاکٹر کلیم انصاری، دھولیہ)

جواب

میرے نزدیک اصل مسئلہ نظام کا نہیں ہے بلکہ افراد کا ہے۔ نظام افراد کو نہیں بناتا بلکہ یہ دراصل افراد ہیں جو نظام کو بناتے ہیں۔ خود اسلام کے دور اول کی تاریخ بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی جو لوگ (اسلامی نظام قائم کرو) کے نام پر نام نہاد انقلابی تحریکیں چلاتے ہیں اور

مفروضہ مخالفین اسلام کو گولی مار کر یا پھانسی دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان کا یہ عمل اتنا زیادہ بے معنی ہے کہ وہ یا تو ان کی عقل کو مشکوک ثابت کرتا ہے یا ان کی نیت کو۔ چونکہ عقل پر شک کرنا اھون ہے اس لئے میں اس معاملہ میں اسی رائے کو اختیار کرتا ہوں۔ کیوں کہ اس طرح نہ کبھی اسلامی نظام قائم ہوا ہے اور نہ وہ کبھی قائم ہوسکتا ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے کی طرف پہلا انسان سازی ہے نہ کہ وہ توڑ پھوڑ یا تخریبی سیاست جو آج اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر مختلف مسلم ملکوں میں جاری ہے۔ جہاں تک اسلام کے معاشی نظریات کو عصری اسلوب میں بیان کرنے کا سوال ہے اس پر موجودہ زمانہ میں بہت سی قیمتی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ مثال کے طور پر ایم عمر چھاپرا کی کتاب:

Towards a just Monetary System

اس کتاب پر سعودی عرب کی طرف سے انعام بھی دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اس موضوع پر کثیر تعداد میں مقالات اور رپورٹیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ مگر عملاً ان کا کوئی فائدہ نہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے افراد کار موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے معاشی نظام پر لکھنے اور بولنے والے لوگ خود اپنے آپ کو غیر اسلامی معاشی نظام کا پرزہ بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں، صرف اس لئے کہ اسلام کا معاشی نظام قائم کرنے میں انھیں فوری طور پر ذاتی فائدہ ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔ جبکہ اسلامی معاشی نظام کا پرزہ بننے میں فوراً ہی ان کو بڑے بڑے مادی فائدے ملنے لگتے ہیں۔

سوال

آج کل عالم اس کو کہا جاتا ہے جس کے نام کے ساتھ قاسمی، ندوی، مظاہری وغیرہ نسبتی لفظ لگا ہوا ہو۔ کیا عالم کی یہ تعریف درست ہے؟ (مفتی محمد ظہیر قاسمی، ناندیڑ)

جواب

عالم ہونے کے لئے مدرسہ سے تحصیل علم کی شرط درست ہے۔ مگر یہ شرط درست نہیں کہ نام

کے ساتھ قاسمی یا ندوی جیسا کوئی لفظ لگا ہوا ہو۔ نام کے ساتھ اس قسم کا لاحقہ لگانا اکابر علماء کی روایت نہیں، مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شبلی نعمانی جیسے افراد جو مسلمہ طور پر عالم تھے مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ایسا کوئی لاحقہ نہیں لگایا۔ کے ساتھ قاسمی یا ندوی جیسا کوئی لفظ لگا ہوا ہو ۔ نام کے ساتھ اس قسم کا لاحقہ لگانا اکابر علماء کی روایت نہیں، مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شبلی نعمانی جیسے افراد جو مسلمہ طور پر عالم تھے مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ایسا کوئی لاحقہ نہیں لگایا۔ کے ساتھ قاسمی یا ندوی جیسا کوئی لفظ لگا ہوا ہو۔ نام کے ساتھ اس قسم کا لاحقہ لگانا اکابر علماء کی روایت نہیں، مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شبلی نعمانی جیسے افراد جو مسلمہ طور پر عالم تھے مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ایسا کوئی لاحقہ نہیں لگایا۔

سوال

ستمبر ۱۹۹۹ کے اردو الرسالہ کے صفحہ ۴۶ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے پہلے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مجھے بابری مسجد کے بارے میں بات چیت کے لئے بلایا تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس، نئی دہلی میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ میں نے کہا بابری مسجد کو بچانے سے بھی بڑا مسئلہ ملک کو بچانا ہے'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ حضرات ملک کے وزیر اعظم کے سامنے مسجد بچانے کے لئے نہیں، مسلمانوں کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے رو پڑے۔ ایک داعی کے لئے جس پر دنیا بھر کے لوگوں کی نظر لگی ہوئی ہو یہ بات کہنا دعوت کے لئے مضر ہے۔ لوگ اس کو لے کر چہ مگوئیاں کر رہے ہیں۔ أحب البلاد الی اللہ مساجد ھا حدیث میں آیا ہے۔ آپ حضرات ملک کے لئے روتے ہیں لیکن مسجد کے لئے

یا مسلمانوں کے لئے یہ رونا نہیں۔ کسی بھی پیغمبر سے اس طرح کا رونا ملک کے لئے ثابت نہیں۔

(محمد اکرم الزھری، سلالہ، سلطنت عمان)

جواب

مذکورہ حدیث کا حوالہ یہاں غیر متعلق ہے۔ یہ حدیث تفصیل کے ساتھ صحیح ابن حبان (جلد اول) میں آئی ہے۔ صحیح مسلم (کتاب المساجد) میں اس کے پورے الفاظ یہ ہیں : احب البلاد الی اللہ مساجد ھا وابغض البلا دالی اللہ اسو اقھا (اللہ کے نزدیک شہروں میں سب سے محبوب جگہ اس کی مسجدیں ہیں اور اللہ کے نزدیک شہروں میں سب سے مبغوض جگہ اس کے بازار ہیں)۔ اس حدیث میں جو تقابل ہے وہ مساجد اور اسواق کے درمیان ہے۔ امام نووی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : المساجد محل نزول الرحمۃ والا سواق ضد ھا (صحیح مسلم بشرح النووی ۵/۱۷۱) یعنی مسجدیں اللہ کی رحمت کے نزول کا مقام ہیں اور بازار اس کا ضد ہیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے اس حدیث سے بلاد کے مبغوض ہونے کا مسئلہ نکال لیا۔ حالاں کہ اس حدیث میں جس چیز کے مبغوض ہونے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، وہ اسواق ہیں، یعنی شاپنگ اور مارکیٹنگ کا تباہ کن شوق جس میں آج دنیا بھر کے مسلمان مرد اور مسلمان عورت بری طرح مبتلا ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری مذکورہ گفتگو کا تعلق عمومی معنوں میں مساجد کے بارے میں نہیں تھا بلکہ وہ خصوصی طور پر صرف ایک مسجد کے بارے میں تھا جو لمبے عرصے سے ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان نزاعی بنی ہوئی تھی۔ کچھ خود ساختہ لیڈروں نے اس مسجد کے سوال پر انتہائی غیر حکیمانہ رویہ اختیار کر کے دونوں فرقوں کے درمیان نفرت اور تشدد کو بھڑکا دیا۔ جس کا سب سے زیادہ براخمیازہ فطری طور پر خود مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ نیز اس کے نتیجہ میں جو باہمی تلخی پیدا ہوئی اس نے ملک میں دعوت کے ماحول کو بگاڑ دیا۔ میں نے چاہا کہ اس کشیدگی کو ختم کر کے دوبارہ یہاں امن کی فضا اور دعوت کا ماحول قائم کروں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''کوئی پیغمبر ملک کے لئے نہیں رویا''۔ جب میں وزیر اعظم سے کہا کہ ملک کو بچایئے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہاں کی

زمین اور پہاڑ کو بچایئے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملکی سماج کو تشدد سے بچایئے اور یہاں امن قائم کیجئے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس ملک میں امن قائم ہو تو اس کا فائدہ کس کو ملے گا۔ چھری کو یا خربوزہ کو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں میرا مسلک عین وہی تھا جو تمام دنیا کے علماء نے اس طرح کے حالات میں عملاً اختیار کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۴۷ کی تقسیم کے وقت سیکڑوں مسجدوں کا وہی انجام ہوا جو ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کا ہوا۔ مگر ہندوستانی علماء نے مساجد کو اشو نہیں بنایا بلکہ ملک وقوم کے تحفظ کو اشو بنایا۔ پاکستان (لاہور) میں برٹش حکومت کے دور میں مسجد شہید گنج کو ڈھانے کا واقعہ پیش آیا اور سکھوں نے اس کو گوردوارہ کی حیثیت دے دی۔ آج بھی اس مقام پر ''گوردوارہ سنگھیاں'' کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان بن گیا اور یہاں کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا مگر اس کے بعد تمام پاکستانی علماء اپنے اپنے انداز میں ملک کی تعمیر میں لگ گئے۔ کسی نے اس مسجد کا اشو نہیں اٹھایا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں تقریباً تمام عرب ملکوں میں سیکڑوں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئی ہیں اور یہ سب شہری ترقی کے مقصد کے تحت ہوا۔ اب تمام دنیا کے علماء اور ان کے متعلقین انھیں عرب ممالک میں جا رہے ہیں تاکہ ان شہروں کی ترقی میں اپنا حصہ لے سکیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ پہلے تمام ڈھائی ہوئی مسجدوں کو ان کی سابق جگہ پر دوبارہ تعمیر کرو، اس کے بعد ہم تمہارے ملکوں میں آئیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بابری مسجد (اجودھیا) کے معاملہ میں جو مسلک میں نے اختیار کیا وہ عین وہی تھا جو عقل اور شریعت کا تقاضا ہے۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ عام مسجدوں کی طرح ایک مسجد نہیں۔ بلکہ آغاز ہی سے وہ ایک نزاعی مسجد کی حیثیت رکھتی تھی اور کسی بھی نزاعی معاملہ میں عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ اس کو حکمت اور تدبر کے ذریعہ حل کیا جائے نہ کہ غوغا آرائی کے ذریعہ۔ بابری مسجد کی مخصوص حیثیت کو بتانے کے لئے یہاں میں صرف ایک حوالہ نقل کرتا ہوں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''ہندوستان اسلامی عہد میں''۔ وہ ۱۹۷۲ میں (عربی میں) حیدرآباد سے اور ۱۹۷۳ میں

(اردو میں) لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مبسوط مقدمہ شامل ہے۔ اس میں انھوں نے اس کتاب کے بارے میں یہ الفاظ درج کئے ہیں: ''ہم اہل ملک کے سامنے یہ قیمتی تحفہ اور تاریخی دستاویز پیش کرتے ہوئے مسرت کررہے ہیں''۔ (صفحہ ۲۴) اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے ''ہندوستان کی مسجدیں''۔ اس باب میں ''بابری مسجد اجودھیا'' کے ذیلی عنوان کے تحت یہ سطریں درج ہیں: ''یہ مسجد بابر نے اجودھیا میں تعمیر کی تھی، جسے ہندو رام چندر جی کی جائے ولادت کہتے ہیں، ان کی بیوی سیتا کا ایک واقعہ مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ سیتا کا یہاں ایک مندر تھا، جہاں وہ رہتیں اور اپنے شوہر کے لئے کھانا پکاتی تھیں، اسی جگہ بابر نے ۱۹۲۳ میں یہ مسجد تعمیر کی''۔ (صفحہ ۱۴۱) حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انتہائی نازک مسئلہ تھا۔ لازم تھا کہ اس معاملہ میں خاموش تدبیر کا انداز ا اختیار کیا جائے۔ ۱۹۴۷ کے بعد ابتدائی دور میں ملک کے بڑے علماء نے ایسا ہی کیا۔ بعد کے زمانے میں بدقسمتی سے یہ مسئلہ کچھ غوغا پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ ان کی ناعاقبت اندیشانہ ہنگامہ آرائیوں نے اس مسئلہ کو خطرناک حد تک بگاڑ دیا۔ بعد کے دور کی غوغائی سیاست کے نتیجہ میں نہ صرف بابری مسجد زد میں آگئی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی پھیل گئی جس نے دعوت کے ماحول کو انتہائی حد تک بگاڑ دیا۔ میری کوشش ہر مرحلہ میں یہ رہی ہے کہ بابری مسجد بھی بچی رہے، مسلمان بھی محفوظ رہیں اور دعوت کا ماحول بھی بگڑنے نہ پائے۔ اس پورے پس منظر میں دیکھئے تو آپ کو اس معاملہ میں کوئی اشکال باقی نہ رہیگا۔ آپ کا یہ ارشاد بڑا عجیب ہے کہ میرا رونا مسلمانوں کے لئے نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الرسالہ کا ہر شمارہ اس غلط فہمی کی تردید کے لئے کافی ہے۔ دیگر مسلم مسائل میں عمومی طور پر اور بابری مسجد کے مسئلہ میں خصوصی طور پر اللہ کی توفیق سے میرا وہ مثبت رول رہا ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ آیت ۶۴ میں کیا گیا ہے۔ بابری مسجد کے مسئلہ کو خود ساختہ مسلم رہنماؤں نے جس ناعاقبت اندیشانہ طریقہ پر اٹھایا اس کے نتیجہ میں ملک میں زبردست فساد پھوٹ پڑا۔ اس وقت میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر فسادات کی آگ بجھانے کے لئے اس

میں کود پڑا۔اس معاملہ میں اللہ کی توفیق سے میں نے جو کام کیا اس کا کچھ تذکرہ الرسالہ کے شماروں میں آتا رہا ہے۔ یہاں میں صرف ایک حوالہ نقل کروں گا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد جب ملک میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو میں نے کچھ ممتاز ہندو شخصیتوں کو ساتھ لے کر ایک شانتی یاترا نکالی اور ۳۵ مقامات پر گیا۔تقریباً تین ہفتہ کی یہ شانتی یاترا ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں تفصیل سے کور کی گئی۔اللہ کے فضل سے اس شانتی یاترا کا غیر معمولی اثر ہوا اور اسکے بعد فسادات کی آگ بجھ گئی۔ یہ سفر کن ہنگامی حالات میں ہوا تھا اس کا اندازہ ''شانتی یاترا'' کے نام سے شائع ہونے والی رپورٹ (الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳) سے ہوسکتا ہے۔اس وقت حالت یہ تھی کہ شہروں میں کرفیو نافذ تھے اور جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔اس وقت میرا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک مقام پر جب میں آگ اور دھوئیں کے ماحول میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو میں بے اختیار رو رہا تھا۔ میں نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی۔ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ جس آگ کو فائر بریگیڈ کا پانی نہ بجھا سکا اسے ہم اپنے آنسوؤں سے بجھادیں۔(اسفار ہند صفحہ ۹۶)

سوال

دو سوالات کے جوابات آپ سے مطلوب ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا روم ڈارون سے پہلے اصول ارتقاء پیش کر چکے ہیں۔آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔دوسرا سوال یہ ہے کہ درج ذیل شعر میں نے کہیں پڑھا تھا، شعر یوں ہے:

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی　　جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

اس کا خالق کون ہے؟، اگر بتا سکیں تو مہربانی ہوگی۔(احساس آفاقی، ونوبا بھاوے نگر، کرلا۔ 400070)

جواب

یہ صحیح ہے کہ مولانا جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳) کے یہاں حیاتیاتی ارتقاء کا ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔مثلاً ان کا یہ شعر: از نباتی ور حیاتی اوفتاد۔اسی طرح ابن مسکویہ (وفات ۱۰۳۰) نے بھی

اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ ان حضرات کی ذاتی ایجاد نہیں۔ اصل یہ ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے یونان کے بعض فلسفیوں نے حیاتیاتی ارتقاء کا تصور اپنی ابتدائی صورت میں پیش کیا تھا۔ جب یونانی کتابوں کے عربی ترجمے ہوئے تو یہ نظریہ مسلمانوں تک پہنچا اسی یونانی تصور کو مولانا روم اور ابن مسکویہ وغیرہ نے دہرایا ہے۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد یورپی علماء کے نام لئے جاتے ہیں۔ مثلاً لامارک (وفات ۱۸۲۹) وغیرہ۔ چارلس ڈارون (وفات ۱۸۸۲) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حیاتیاتی ارتقاء کے قدیم نظریہ کو پہلی بار مرتب علمی انداز میں پیش کیا۔ اس موضوع پر اس کی کتاب انواع حیات (The Origin of Species) ۱۸۵۹ میں شائع ہوئی۔ تاہم حیاتیاتی ارتقاء یا عضویاتی ارتقاء کا نظریہ قدیم اور جدید دونوں صورتوں میں غیر ثابت شدہ ہے۔ یہ آج بھی صرف ایک قیاسی نظریہ ہے کہ کوئی ثابت شدہ واقعہ۔ مثلاً مختلف ملتی جلتی انواع حیات کو ایک ترتیب میں کھڑا کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک سے دوسرا نکلا، دوسرے سے تیسرا نکلا، تیسرے سے چوتھا نکلا، وغیرہ۔ مگر صرف یہ ایک دعویٰ ہے۔ ان مماثل مظاہر حیات کی دوسری زیادہ قریب تر توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان ان میں سے ہر ایک کو مستقل اور منفرد نوع حیات مانا جائے۔ آپ نے جو شعر نقل فرمایا ہے اس کے شاعر کا نام تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ وہ مجھ کو پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس مشہور شعر کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ درست اور بامعنی ہے :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اقبال کا مذکورہ شعر میرے نزدیک صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے، قرآن وحدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے مقابلہ میں آپ کا نقل کردہ مذکورہ شعر موجودہ صورت حال کی نہایت صحیح ترجمانی ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف مقامات پر نظام مصطفیٰ اور نظام اسلام کے نام پر جو نام نہاد متشددانہ جہاد جاری ہے وہ بلاشبہہ اس شعر کا مصداق ہے۔ یہ اسلام کے نام پر ایک ایسا اسلامی فعل ہے جس کی کوئی دوسری مثال چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس موضوع پر الرسالہ میں بار بار لکھا جا چکا ہے۔ یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سوال

عام طور پر مسلمانوں کے اخبارات اور رسائل یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر ظلم کیا جاتا ہے اسی لئے وہ اقتصادی ترقی نہیں کر پاتے۔ اگر یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کی صورت کیا ہے؟۔ (ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

یہ شکایت درست نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی اور ہر گروہ اپنے کئے کو بھگتتا ہے۔ ایک کا مقدر کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ واقعات بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ مسلمان اس ملک میں مسلسل اقتصادی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام مسٹر عظیم ہاشم ہے۔ ملاحظہ ہو (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون ۱۹۹۹)

سوال

حکمت یا وزڈم کیا ہے؟۔ حکیم (Wise man) کس کو کہا جا سکتا ہے؟۔ میرا احساس یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا واضح تصور نہیں ہے۔ اکثر لوگ محض خوش فہمی کی بنا پر کسی کو حکیم الاسلام اور کسی کو حکیم الامت کہنے لگتے ہیں۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبد السلام اکبانی، ناگپور)

جواب

حکمت یا وزڈم ایک اعلیٰ ذہنی صفت ہے۔ میرے علم کے مطابق، انسانی تاریخ میں سب سے کم پائی جانے والی صفت یہی ہے۔ عام زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ حکمت ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جو گہری بصیرت کے نتیجہ میں کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ برٹش کلرجی مین اور مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) ۱۸۶۰ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی نہایت درست طور پر حکیم یا دانا شخص کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ دانا انسان وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کیا ہے، انگریزی ڈکشنری میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے: کسی اور چیز کی نسبت سے اہمیت و معنویت ہونا:

Having significance in relation to something else

اس حکمت یا دانائی کی ایک تاریخی مثال حدیبیہ کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کا ایک پہلو وہ تھا جو بظاہر سب کو دکھائی دیتا تھا۔ یعنی پیغمبر اسلام کا مخالفین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان لینا۔ بظاہر یہ طریقہ اتنا نازیبا تھا کہ حضرت عمر نے اس کو دَنِیّہ قرار دیا۔ یعنی ذلت کو اختیار کرنا۔ (البدایۃ والنھایۃ ۱۶۸/۴)۔ مگر اسی کے ساتھ اس معاملہ کا ایک اور پہلو تھا جو بظاہر معاہدہ کے وقت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی طرح اگر ایسا ہو کہ باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا میں انٹرایکشن ہونے لگے تو لوگوں کے اندر تیزی سے اسلام پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب کہ دشمن لوگ اسلام کے قریبی مددگار بن جائیں (حم السجدہ ۳۴) جیسا کہ بعد کو عملاً پیش آیا۔ گویا حدیبیہ کے معاہدہ کا ایک پہلو وہ تھا جس کو ہر صاحب بصارت دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ایک اور اہم تر پہلو وہ تھا جس کو صاحب بصیرت ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: **فعلم ما لم تعلموا** (الفتح ۲۷) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی۔

اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کو جاننے کی اہمیت یہ ہے کہ اکثر حالات میں یہی پہلو عملی اعتبار سے فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم مفکرین کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ وہ اس حکیمانہ بصیرت سے خالی تھے۔ وہ سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر اقدامات کرتے رہے۔ وہ ان دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہے جو آخر کار فیصلہ بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اقدامات نہ صرف بے نتیجہ رہے بلکہ وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والے (**counter productive**) ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر مصر اور پاکستان اور ایران میں اسلام پسندوں کا یہ سمجھ لینا کہ ان کی معاصر حکومت تمام خرابیوں

کی جڑ (source of all evils) ہے۔ اگر وہ کسی طرح موجودہ حکمراں کو اقتدار سے ہٹادیں تو وہاں شاندار طور پر اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح برصغیر ہند میں مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہے۔ ان تمام رہنماؤں کی مشترک کوتاہی یہ تھی کہ وہ صرف سامنے کی باتوں کو دیکھ سکے، وہ ان اضافی اسباب (relative factors) کو دیکھنے سے عاجز رہے جو آخر کار فیصلہ کن بن کر تمام خوش فہمیوں کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام رہنماؤں کی ہنگامہ خیز تحریکیں مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر فاروق نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کم تر شر کون سا ہے۔ (لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین)

سوال

الرسالہ مئی ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون ''جنتی کون'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ: جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے اسی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ (صفحہ ۴) اس جملہ کی وضاحت مطلوب ہے۔ دنیا میں خدا کو بالواسطہ طور پر دیکھنے سے کیا مراد ہے؟۔ (عبدالسلام، جامعہ دارالسلام، عمر آباد)

جواب

''خدا کو بالواسطہ دیکھنے'' سے مراد وہی چیز ہے جس کو حدیث میں تعبد الله کانک تراه (البخاری) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کیا کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے صرف اس کو قابل فہم بنانے کے لئے نئے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک ہے خدا کی ذات کو دیکھنا۔ دوسرا ہے خدا کی آیت اور آلاء کے ذریعہ خدا کو پہچاننا۔ پہلے معنی میں صرف آخرت میں کسی کو خدا کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔ دوسرے معنی میں یہ تجربہ اسی دنیا میں

گزرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، دنیا میں آدمی گویا کہ خدا کو دیکھتا ہے اور آخرت میں وہ خدا کو حقیقی طور پر دیکھے گا۔ پہلا دیکھنا بالواسطہ طور پر دیکھنا ہے، اور دوسرا دیکھنا براہ راست طور پر دیکھنا۔

سوال

قرآن نے سوچنے اور سمجھنے کی نسبت قلب کی طرف کی ہے اور حالیہ سائنس کی تحقیقات یہ ہیں کہ یہ دونوں صلاحیتیں دماغ کی ہیں۔ دل (قلب) کی حیثیت ایک پمپ سے زیادہ نہیں۔ تو اس میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن میں قلب کا لفظ حیاتیاتی اصطلاح کے طور پر نہیں آیا بلکہ اپنے ادبی استعمال کے طور پر آیا ہے اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں آج بھی قلب کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جس معنی میں وہ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے معروف اصول کے مطابق، قرآن کی ان آیتوں میں قلب کے لفظ کو اس کے ادبی مفہوم کے اعتبار سے لینا چاہیئے نہ کہ اس کے حیاتیاتی مفہوم کے اعتبار سے۔ قلب کے لئے انگریزی میں ہارٹ (Heart) کا لفظ ہے۔ حیاتیاتی کتاب میں اس لفظ کی تشریح گردش خون کے مرکز کی حیثیت سے ملے گی۔ لیکن آپ انگریزی کی کوئی ڈکشنری دیکھیں تو اس میں درجنوں ایسے استعمال ملیں گے جن میں ہارٹ کو مرکز جذبات کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً With all one's heart یعنی بہت خوشی سے۔ شیکسپیر کی ایک لائن اس طرح ہے: A good heart is worth gold اس معاملہ کا تعلق صرف قلب سے نہیں ہے بلکہ دوسرے سیکڑوں الفاظ سے بھی ہے۔ مثلاً سن لائٹ اور مون لائٹ، وغیرہ۔

سوال

تقدیر کیا ہے؟ انسان کا معاملہ تقدیر کے تحت ہے یا تدبیر کے تحت۔ اگر تقدیر کے تحت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسان مجبور ہے۔ پھر انسان کا امتحان کیوں؟ اور اگر تدبیر کے تحت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ بہت سے معاملات میں انسان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ (محمد اسحاق۔ عمر آباد)

جواب

یہ معاملہ پیچیدہ اس لئے نظر آتا ہے کہ لوگ اس معاملہ میں ثنائی طرز فکر (Dichotomous thinking) کا شکار ہیں۔ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ یا تو سارا معاملہ تقدیر پر مبنی ہے یا سارا معاملہ تدبیر پر۔ حالانکہ یہ معاملہ ففٹی ففٹی کا ہے۔ یعنی جزئی طور پر تقدیری اور جزئی طور پر تدبیری۔ ایسا اس لئے ہے کہ انسان موجودہ دنیا آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے اور آزمائش کی مصلحت چاہتی ہے کہ ایسا ہی ہو۔ آدمی جب اپنے آپ کو مجبور محسوس کرے تو وہ عاجزانہ طور پر خدا کو پکارے اور جب وہ اپنے آپ کو آزاد پائے تو وہ خدا کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرے۔ قرآن میں خدا کے مطلوب بندوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے : یدعون ربھم خوفاً وطمعاً (السجدہ۔۱۶)۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ : الایمان بین الرجاء والخوف۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ بندے کے اوپر اپنے رب کی نسبت سے دو مختلف قسم کی کیفیات طاری ہوں۔ کبھی خوف کی کیفیت اور کبھی امید کی کیفیت۔ یہ دو طرفہ کیفیات کسی بندہ کے اوپر صرف اسی وقت طاری ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اس دنیا میں خوف کی حالت کا تجربہ کرے اور کبھی امید کی حالت کا۔ چونکہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہو سکتیں اس لئے انسان کو بیک وقت جبر اور اختیار کے دو طرفہ نظام کے تحت اس دنیا میں رکھا گیا۔

جہاں بریک لگانا ہو وہاں گاڑی کو تیز کرنا منزل کی طرف سفر کرنے کے بجائے قبرستان کی طرف اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے۔

(الرسالہ جولائی ۸۸)

سوال

مجھے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اصول کیا ہے؟۔ (ایک قاری، الرسالہ)

جواب

قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس کا علمی اور فنی مطالعہ اور دوسرا ہے قرآن کا تذکیری مطالعہ۔ اگر آپ قرآن کا علمی اور فنی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو بہت سے علوم میں گہری واقفیت پیدا کرنی ہوگی جن کی تعداد اہل تفسیر نے کئی درجن بتائی ہے۔ مگر اس قسم کا مطالعہ مخصوص علماء کا کام ہے۔ وہ عام انسان کی ضرورت نہیں۔ عام انسان جو قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا چاہتا ہو اور اس کو پڑھ کر اپنی فکری اور علمی اصلاح کرنا چاہتا ہو، ایسے انسان کے لئے درجنوں علوم میں مہارت پیدا کرنا ضروری نہیں۔ ایسے آدمی کے لئے دو چیزیں کافی ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عربی زبان سے واقفیت ہو اور صالح نیت کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ تاہم اسی کے ساتھ اس کو مستند تفسیروں کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہیئے۔ خاص طور سے عربی تفسیروں کا۔ ورنہ دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی تفسیروں کا مطالعہ بھی اس کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق آیتوں کا مفہوم متعین نہ کرے بلکہ خود قرآن نیز حدیث کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کا درست مطالعہ آدمی کو ہدایت تک پہنچاتا ہے اور اس کا نادرست مطالعہ برعکس نتیجہ کا سبب بنتا ہے۔

ہر انسان قدرت کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔ یہ صرف مشکلات
کی ٹھوکریں ہیں جو اس خزانہ کو اندر باہر لے آتی ہیں۔

(الرسالہ اکتوبر ۸۹)

سوال

الرسالہ (اردو) دسمبر ۱۹۹۹ کے صفحہ نمبر ۳۴ پر کچھ مسلموں کے استفسار پر کہ ''پیغمبر اسلام آخری پیغمبر ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے'' جواب میں آپ نے ان سے کہا کہ ''کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہی واقعہ اس کی تاریخی دلیل ہے۔'' ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ماضی میں جن لوگوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، ان کے اس دعویٰ کے بارے میں آپ کیا جواز پیش کریں گے؟۔ مثلاً مسیلمہ کذاب اور غلام احمد قادیانی وغیرہ وغیرہ۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالقیوم شارق، مرتضیٰ پور، مہاراشٹر)

جواب

میرا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی شخص نے مستقل بالذات نبوت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ رسول اللہ کے ہم عصر مسیلمہ بن حبیب الحنفی (وفات ۶۳۳ء) نے مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ :انی قد اشرکت فی الا مر معه ۔سیرة ابن هشام ۲۴۴/۴ ۔(یعنی میں محمدؐ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ کے دعویٰ کے مطابق اس کی نبوت کا معاملہ خود پیغمبر کی تصدیق حاصل کرے۔ آپ نے مسیلمہ کو کاذب قرار دیا اس کے بعد اس کی نبوت کا دعویٰ اپنے آپ بے بنیاد ثابت ہو گیا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی (وفات ۱۹۰۸) نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس نے ظلِ نبوت ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یعنی میں محمدؐ کی نبوت کا سایہ ہوں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشگی طور پر فرما چکے ہیں کہ :لیس بعدی نبی (صحیح البخاری، کتاب المغازی۔ یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس لئے مرزا غلام احمد کا دعویٰ بھی رسول اللہ کی تصدیق پر منحصر تھا اور آپ کی پیشگی تردید کی بنا پر یہ دعویٰ اپنے آپ باطل قرار پا گیا۔ اسی طرح ایران کے

بہاءاللہ (وفات ۱۸۹۲ء) کے بارے میں سمجھا جاتا ہی ہے کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ انھوں نے اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں ''مظہر الٰہی'' ہوں۔ اس بنا پر وہ بنا پر وہ دعویٰ کے درجہ میں بھی اس فہرست میں نہیں آتے۔

اس سلسلہ میں مجھے ذاتی طور پر دو تجربے ہوتے ہیں۔ پہلا نرنکاری مشن (نئی دہلی) کے گرو گربچن سنگھ (وفات ۱۹۸۰) کے بارے میں ہے۔ ۱۹۷۵ میں نرنکاری مشن کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے انگریزی میں چھپا ہوا ایک پمفلٹ مجھے دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ بابا گربچن سنگھ وقت کے پیغمبر (Prophet of Time) ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے سنٹر میں آؤں گا اور بابا گربچن سنگھ میرے سامنے یہ جملہ کہیں کہ ''میں وقت کا پیغمبر ہوں''۔ آپ لوگ بابا جی سے بات کر کے تاریخ اور وقت مقرر کر دیں تا کہ میں اس وقت وہاں پہنچ سکوں۔ ان لوگوں نے بابا جی سے گفتگو کر کے تاریخ اور وقت طے کیا اور پھر مجھے ٹیلیفون پر مطلع کیا۔ اس کے مطابق میں بابا جی کے یہاں پہنچا۔ میں بابا جی کے پاس ۴۵ منٹ تک رہا مگر انھوں نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، اس کے بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، آخر کار میں واپس چلا آیا۔

میرا دوسرا تجربہ شانتی گری آشرم (ترونڈرم) کے گرو جی کے بارے میں ہے۔ وہ ۶ مئی ۱۹۹۹ کو آشرم میں انتقال کر گئے۔ مارچ ۱۹۹۹ میں ان کے یہاں ایک کانفرنس ہوئی۔ ان کے کچھ شاگرد دہلی آئے اور مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے شانتی گری آشرم کے تعارف پر ایک انگریزی پمفلٹ مجھے دیا جس میں لکھا تھا کہ گرو جی وقت کے پیغمبر ہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی کانفرنس میں آؤں گا اور میرا خاص مقصد یہ ہوگا کہ میں آپ کے گرو جی سے اس دعویٰ کی بابت سوال کروں۔ وہ خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں سفر کر کے شانتی گری آشرم پہنچا جو تری وندرم ایرپورٹ سے تقریباً بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک سوا ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ یہاں میں نے دو دن قیام کیا۔ اس درمیان میں گرو جی سے دو بار ملاقات ہوئی۔ ایک ملاقات میں ان کی شاگردوں کی موجودگی

میں بابا جی سے میں نے یہ سوال کیا:

Do you claim that you are a prophet of God in the same sense in Moses, Jesus and Mohammad claimed to be prophet ofwhich God?

میرے اس سوال کے جواب میں بابا جی نے صاف طور پر کہا کہ نہیں، (No) میں ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ یہ دوسروں کے اوپر ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد میں نے ان کے مذکورہ شاگردوں سے کہا کہ جب آپ کے بابا جی پیغمبر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو آپ لوگ کیسے انہیں پیغمبر بتاتے ہیں۔ اگر خدا کسی کو اپنا پیغمبر بنائے تو سب سے پہلے خود اس آدمی کو اپنے پیغمبر ہونے کا علم ہوگا جس کو پیغمبر بنایا گیا ہے، نہ کہ اس کے سوا دوسرے لوگوں کو۔

اپنے مطالعہ اور تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کہنا کہ ''میں خدا کا پیغمبر ہوں'' ہمالیہ پہاڑ اپنے سر پر اٹھانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس قسم کا جملہ وہی بول سکتا ہے جو واقعۃً خدا کا پیغمبر ہو۔ غیر پیغمبر ایسا جملہ بولنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔

سوال

آپ اکثر الرسالہ میں لکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مواقع کھل گئے ہیں اور بلا روک ٹوک اسلامی دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو اس کے خلاف بتاتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم حلقہ کے ایک شاعر نے اپنے حلقہ کے فکر کی ترجمانی ایک شعر میں اس طرح کی ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی　　سننی پڑی ہے طنز اسے خاص و عام کی

آخر یہ دو طرح کی بات کیوں؟۔ دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟۔ (ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

اس قسم کے اشعار سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ شعر تو ایک لفظی تک بندی ہوتا ہے اور لفظی تک بندی آپ جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، حتی کہ متضاد انداز میں بھی۔ مثلاً مذکورہ شعر کو لفظ بدل کر

اس طرح برعکس طور پر بھی کہا جاسکتا ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی　　اس کو ملی ہے داد خواص وعوام کی

آپ تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آئے گا۔ یہ ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کی ''بات'' بیان کرنے والوں میں سے سب سے بڑا گروہ محدثین کا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کرام کے بعد امت میں سب سے زیادہ عزت واحترام جس کو ملا وہ یہی محدثین کا گروہ ہے۔ حتی کہ آج بھی کسی دارالعلوم کے شیخ الحدیث کو جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور کو نہیں ملتی، اصل یہ ہے کہ مذکورہ شعر یا اس قسم کی بات کہنے والے دوسرے حضرات ایک مغالطہ کا شکار ہیں۔ وہ ''نبی کی بات'' اور ''نبی کے نام پر اپنی بات'' کے فرق کو نہیں جانتے۔ نبی کی بات کو کہنا اصل پیغام کو پہنچانا ہمیشہ لوگوں کے درمیان پسندیدہ کام رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ ''نظام مصطفیٰ'' کے نام پر تحریکیں چلاتے ہیں اور ان کو مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے اس کا تعلق ''نبی کی بات'' سے نہیں ہے بلکہ نبی کے نام پر حکمرانوں کے خلاف ٹکراؤ کی سیاست چلانے سے ہے اور ٹکراؤ کی سیاست ہمیشہ ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ نظام مصطفیٰ کے خود ساختہ علم بردار لوگ خود اپنی غیر پیغمبرانہ سیاست کی قیمت پا رہے ہیں اور اس کو خلاف واقعہ طور پر پیغمبر سے منسوب کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ انہوں نے اپنی یہ غیر پیغمبرانہ سیاست پیغمبر کے نام پر چلائی تھی۔

سوال

مسلمان اپنے آپ کو ہندو کہلانا کیوں ناپسند کرتے ہیں؟۔ ہندو کوئی مذہبی شبد نہیں۔ یہ ایک جغرافی شبد ہے۔ بھارت کے جغرافیہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ہندو ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح جرمنی کے جغرافیہ میں رہنے والے سب جرمن ہیں۔ اس دیش میں ہندو اور مسلمان دونوں ہندو ہیں۔ مسلمان اگر اس بات کو مان لیں تو ہمارے دیش کا سارا جھگڑا ختم ہو جائے اور یہاں سماجی امن قائم ہو جائے (ایم۔ ایس۔ شرما، نئی دہلی)

جواب

جرمنی میں رہنے والے تمام لوگ اس لئے جرمن کہے جاتے ہیں کہ ان کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ مگر انڈیا کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا نہیں۔ اس کے مطابق اس ملک میں رہنے والے سب لوگ انڈین یا بھارتی ہیں۔ لہذا جرمن اور ہندو کے معاملہ کو یکساں کیسے بتایا جاسکتا ہے۔

اس معاملہ کی دوسری نظریاتی بنیاد یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کی قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہو۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، وید یا پران یا گیتا میں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ اس دیش میں رہنے والے سب کے سب ہندو ہیں۔ بلکہ ہندو کا شبد تو ان کتابوں میں موجود ہی نہیں۔ پھر آخر وہ کون سی نظریاتی دلیل ہے جس کی بنیاد پر ایسا کہا جائے۔

محض کسی کا دعویٰ اس تصور کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مثلاً لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی ان کا مذہبی نام نہیں ہے۔ ان کا اپنا اختیار کردہ نام مسیحی یا کرسچین ہے۔ عیسائی دراصل ایک جغرافی شبد ہے اور اس ملک کے رہنے والے سب کے سب عیسائی ہیں۔ اگر محض دعویٰ کافی ہو تو ہر گروہ اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

جہاں تک سماجی امن کا تعلق ہے، اس کا ہندو نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ محض کسی لفظ کے ادل بدل سے سماجی جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ مہاتما گاندھی اور گاڈسے دونوں اپنے کو ہندو کہتے تھے، اس کے باوجود گاڈسے نے گاندھی کو مار ڈالا۔ بہار کے اونچی ذات کے ہندو اور نیچی ذات کے ہندو دونوں اپنے کو ہندو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اٹل بہاری باجپئی اور کلیان سنگھ دونوں مذکورہ معنوں میں اپنے کو ہندو بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا اختلاف پیدا ہوا کہ دونوں الگ الگ ہو گئے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس قسم کے کلچرل اختلاف کو مٹانے کے بجائے اس معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے دی جائے۔ گرو گولوالکر نے درست طور پر کہا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے

Nature abhors uniformity:

اور جب خود فطرت ہی میں فرق اور تنوع موجود ہے تو اس کو مٹانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ سماجی امن کا راز کلچرل یکسانیت میں نہیں بلکہ کلچرل تنوع کو تسلیم کرنے میں ہے۔ اس مسئلہ کا حل کا درست اور قابل عمل فارمولا صرف یہ ہے: ایک کی پیروی اور سب کا احترام

Follow one and respect all :

سوال

(۱) قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو'' (بنی اسرائیل) اس آیت کو اگر اس کے سادہ معنوں میں لیا جائے تو اب تک جتنی آیاتِ الٰہی کائنات میں ڈسکور (**discover**) ہوئی ہیں جو کہ پہلے لامعلوم تھیں وہ ڈسکور نہ ہوتیں۔ یا پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ (۲) قرآن میں ہے: ''تم میں کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو'' (مریم ۷۱) کیا اس آیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں حتیٰ کہ پیغمبر اور صحابہ بھی۔ (عبدالشکور انجینئر، چمن، بلوچستان)

جواب

ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا علم نہیں (بنی اسرئیل ۳۶) اس آیت کا تعلق کائنات سے نہیں ہے بلکہ انسان سے ہے۔ جہاں تک کائناتی حقیقتوں کا معاملہ ہے ان کا حکم دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ اس آیت سے۔ قرآن میں کثرت سے اس پر ابھارا گیا ہے کہ کائنات کی نشانیوں پر غور کرو۔ حتیٰ کہ کائنات میں غور وفکر کو ایمان کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے اور وہ اسلام میں بے حد مطلوب ہے۔ اس سے مومن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت کا تعلق ہے، وہ ایک اخلاقی ہدایت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے معاملہ میں حسن ظن سے کام لو۔ بدگمانی کا شکار ہو کر غیر ضروری ٹوہ میں نہ لگو۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں دوسری جگہ تجسس کہا گیا ہے اور اسکو سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (الحجرات ۱۲)

سورہ مریم (آیت ۷۱) میں آخرت کے جس تجربہ کا ذکر ہے اس کی تشریح تذکیر القرآن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں ورود کا مطلب دخول نہیں بلکہ اس کا مطلب مرور ہے۔ یعنی تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے، نہ کہ وہ اس کے اندر داخل ہوں گے۔ چنانچہ

صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کو جسر (پُل) جیسا معاملہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک طوفانی دریا کے اوپر پُل ہو اور آپ اس پُل سے گزریں تو آپ دریا کی ہولناک موجوں کو دیکھیں گے لیکن آپ اس کے اوپر سے صحیح وسلامت گزر جائیں گے۔

سوال

آپ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ آج ہمارے لئے یہ موقع ہے کہ ہم آزادی کے ماحول میں اسلامی دعوت کا کام کرسکیں۔ مگر واقعات اس کے برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔ کوسووا، بوسنیا، سیریا، مصر، عراق، برما، کشمیر، امریکہ، میں کیا ہورہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ظلم وزیادتی کا شکار ہورہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں کی جارہی ہیں۔ پھر مذہبی آزادی کہاں ہے؟۔ یہ سوال ہم کو بذریعہ انٹرنیٹ مائیکل شمڈت (Michael Schimidt) کی طرف سے موصول ہوا ہے۔

جواب

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کو مذہبی زیادتی کا سامنا پیش آرہا ہے وہاں یہ مسئلہ کب سے پیدا ہوا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کی طرح ان ملکوں میں بھی مسلمانوں کو مکمل امن اور آزادی حاصل تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان کچھ ناعاقبت اندیش لیڈر اٹھے جنھوں نے جذباتی نعروں کے ذریعہ مسلمانوں کو بھڑکایا اور انھیں مقامی حکمرانوں سے ٹکرادیا۔ جب ایسا ہوا تو اس کے بعد وہ مسائل پیدا ہوئے جن کو آپ مذہبی زیادتی کے مسائل کہتے ہیں۔ مذکورہ ملکوں میں سے ہر ملک کا معاملہ یہی ہے۔ ان مقامات پر مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ملک اور مال کے نام پر سیاسی جنگ نہ چھیڑتے۔ وہ ملی ہوئی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے دعوتی اور تعمیری کام کرتے تو یقینی طور پر انھیں زیادتیوں کا شکار نہ ہونا پڑتا جن کا ذکر آپ اخباروں میں دیکھتے ہیں۔ مذکورہ سوال میں امریکہ کی مثال بھی دی گئی ہے۔ مسائل کے نزدیک وہاں کے مسلمان میڈیا کے شدید مخالفانہ پروپیگنڈوں کا شکار ہورہے ہیں:

Muslims are under a heavy media propaganda campaign.

یہ بات درست نہیں۔ جس چیز کو اسلام کے خلاف میڈیا کا پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔ اس کے ذمہ دار تمام تر خود مسلمان ہیں۔ میڈیا کیا ہے؟ وہ واقعات کے رپورٹ کی انڈسٹری ہے۔ مسلمان جگہ جگہ اسلام کے نام پر متشددانہ تحریکیں چلا رہے ہیں۔ میڈیا اسی کی رپورٹ کرتا ہے۔ چونکہ یہ مسلمان اپنی متشددانہ تحریکوں کو اسلام کے نام پر چلاتے ہیں اس لئے میڈیا بھی ان کو اسلام کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان جو تشدد اسلام کے نام پر کریں گے اس کی رپورٹ بھی اسلام ہی کے نام کی جائے گی۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ یا تو وہ اپنا یہ بے فائدہ تشدد ختم کر کے پرامن ذرائع سے کام کریں یا وہ اپنی متشددانہ تحریکوں کو اسلام اور اسلامی جہاد کے نام پر نہ چلائیں۔ اس کے بعد انھیں میڈیا سے یہ شکایت بھی نہ ہوگی کہ میڈیا اسلام کو بدنام کر رہا ہے۔

سوال

مذہب اور انسان کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ مذہب صرف ایک پہچان کی چیز ہے، یعنی یہ کہ ہم فلاں مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ کون کیا کر رہا ہے تو اس سے کوئی مطلب نہیں رکھنا چاہیئے۔ البتہ ہم دوسروں کی جتنی مدد کر سکیں وہ ہم کو کرنا چاہیئے۔ میرے نزدیک انسان کا اصل مقصد خدمت انسانیت ہے اور سب سے بڑا مذہب انسان کی خدمت کرنا ہے۔ مذہب اور انسان کے بارے میں میرے یہ نظریات ہیں۔ براہِ کرم آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ کیا میرے یہ نظریات درست ہیں؟۔ (محمد قاسم خاں، نئی دہلی)

جواب

سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ موجودہ دنیا میں کسی مذہب کو درست مذہب قرار دینے کے لئے صحیح معیار (criterion) کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہے اور وہ خالق کائنات کا تخلیقی نقشہ ہے۔ یہ تخلیقی نقشہ ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس تخلیقی نقشہ کے مطابق، اس دنیا کے لئے ایک ہی مذہب درست ہے اور وہ مذہب مذہبِ توحید ہے۔ یعنی ایک اللہ کو اپنے خوف اور محبت کے جذبات کا

مرکز بنا کر اس کے مطابق زندگی گزارنا۔

قرآن کے مطابق، شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ وہ مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ آدمی کو مذہب توحید سے ہٹا دے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مختلف مذہب بنائے۔ مثلاً مذہبِ شرک، مذہبِ الحاد،

قرآن کے مطابق، شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ وہ مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ آدمی کو مذہب توحید سے ہٹا دے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مختلف مذہب بنائے۔ مثلاً مذہبِ شرک، مذہبِ الحاد، مذہبِ اشتراکیت۔ اس سلسلہ میں شیطان نے جو سب سے زیادہ خطرناک مذہب ایجاد کیا وہ یہی مذہب انسانیت ہے۔ اس کو موجودہ زمانہ میں ہیومنزم کہا جاتا ہے۔ مگر سادہ طور پر یہ صرف ایک انسانی نظریہ نہیں۔ وہ خدا کو تختِ معبودیت سے ہٹا کر وہاں انسان کو اس کی جگہ بٹھاتا ہے۔

It is like transfering of seat from God to man.

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود، اس کا دل و دماغ، اس کے جذبات و کیفیات سب خالق کی امانت ہیں۔ انسان کا مرکز توجہ پوری طرح صرف ایک خدا کو ہونا چاہئے۔ دوسری ہر چیز، حتی کہ انسانی خدمت بھی، خدا کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ اس سے آزاد۔

سوال

میں آپ کے ذہن و دماغ کا قائل ہوں۔ ساتھ ہی آپ کی خلوصِ نیت کا بھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان آج بھی اپنی دیرینہ طرزِ فکر سے نکل نہیں پا رہے ہیں اور آج بھی نام نہاد قائدین کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔ قائدین کی ان غلطیوں کو ماننا پہلے دشوار معلوم ہوتا تھا مگر اب حقائق کی کثرت نے ان کے تمام فارمولوں کو فیل کر دیا۔ پہلے آپ کی فکر میں آپ کو اکیلا تصور کر رہا تھا مگر حالات و واقعات کا بغور مطالعہ آپ کی فکر کی تائید کرتا ہے۔ آپ کی جانب سے پیغام اور مثبت طرزِ فکر، ان دونوں کو میں نے گانٹھ باندھ لیا ہے۔ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کا استعمال نہایت ہی بہترین فارمولا ہے۔ دراصل ہمارے زیادہ تر سیاسی رہنما **idealis** واقع ہوئے ہیں نہ کہ **realist**۔ اور اول الذکر کی بنیاد پر ایک خیالی دنیا تو تعمیر ہو سکتی ہے مگر حقیقی کامیابیوں سے بھرپور دنیا نہیں۔ مجھے تعجب اس

بات کا ہے کہ آخر آپ اپنے ہم عصروں کی فکر کی زد سے کیسے نکل آئے جب کہ آج بھی ان لوگوں کی فکر مسلمانوں کے اوپر حکمراں ہے۔ یہی بات آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔ آپ جیسے زیرک حضرات کا آج فقدان ہے اور خدا سے دعا ہے کہ آپ جیسے لوگوں کو نوبل انعام سے نوازا جائے۔

میں علامہ اقبال کا **admirer** رہا ہوں اور ان کی فکر پر تنقید کو طفلانہ سمجھتا تھا مگر آپ کی بے لاگ تنقید نے علامہ کی فکر کا جائزہ لینے میں بڑی مدد کی ہے۔ میں اب بتدریج **Idealism** سے **Realism** کی طرف آرہا ہوں اور میری اس دریافت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔

(طارق اشفاق، عماد الملک روڈ، اے ایم یو، علی گڑھ)

جواب

حدیث میں آیا ہے کہ: ان الدین یسر (صحیح البخاری، کتاب الإیمان) یعنی دین آسان ہے۔ اس کے مطابق، دین کو سمجھنا ہر آدمی کے لئے آسان ہونا چاہئے اور بلاشبہ اس کا سمجھنا آسان ہے۔ البتہ خدا کے دین کو سمجھنا اس وقت مشکل ہو جائے گا جب کہ آدمی خدا کے دین کو غیر خدا سے اخذ کرنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں یہی پیش آیا ہے۔ لوگ عام طور پر دین کو اپنے مفروضہ اکابر کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی چیز لوگوں کے لئے فہم دین میں پردہ بن گئی ہے۔ میں خدا کے فضل سے کبھی بھی اکابر پرستی کا شکار نہیں رہا۔ میں امام ابوحنیفہ کے اس قول کو مانتا ہوں کہ **ھم رجال ونحن رجال** ۔ اس لئے میں خود براہِ راست قرآن وسنت سے دین کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس دنیا کے لئے خدا کا یہ قانون ہے کہ جو شخص صحیح راستہ سے کوشش کرے وہ ضرور اپنے مقاصد کو پائے گا۔ (مَن جَدّ وَجَدَ)

اقبال کی مقبولیت کا سبب کیا ہے، وہ خود اقبال کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں کہا: مرا یاراں غزل خوانے شمردند (لوگوں نے مجھے ایک غزل خواں سمجھ لیا) غالباً اقبال یہ سمجھتے تھے کہ ان کہ اشعار قوم کے اندر نئی سوچ لائیں گے اور لوگ تعمیر ملت کے محاذ پر سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ اقبال کے اشعار لوگوں کے لئے ذہنی تفریح کا سامان بن گئے۔ اقبال نے

اپنے مذکورہ شعر میں غالباً اسی کی شکایت کی ہے۔ مگر یہ خود اقبال کی غلطی ہے۔ ان کا یہ سمجھنا درست نہ تھا کہ اشعار کے ذریعہ وہ قوم کے اندر کوئی حقیقی بیداری لا سکتے ہیں۔ شعر ایک لفظی آرٹ ہے۔ وہ انسان کے لئے صرف ذہنی تفریح کا سامان بن سکتا ہے۔ شعر کسی حقیقی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پیغمبر اسلام کے لئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لئے مناسب نہیں (یس ۶۹) مصلح یا داعی نثر کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ شعر کی زبان مصلح اور داعی کی زبان نہیں۔ لوگ عام طور پر تفریح پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے تفریحی کلام تیزی سے لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سنجیدہ نثر لوگوں کے درمیان کم مقبول ہوتی ہے۔ مگر مذکورہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی اصلاح کا کام ہمیشہ نثر کی زبان میں ہوتا ہے نہ کہ ردیف اور قافیہ کی زبان میں۔

سوال

میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ آپ بھاجپا اور آر۔ ایس۔ ایس کے آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو اپنے جلسوں میں بہت بلاتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔

(ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

یہ سراسر بہتان ہے۔ میرا مقصد اسلامی دعوت ہے اور اس مقصد کے لئے میں مسلمانوں کے اجتماعات کے علاوہ غیر مسلموں کے جلسوں میں بھی جاتا ہوں۔ مگر وہ صرف بھاجپا اور آر ایس ایس کے جلسے نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق ہر مذہب کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو، عیسائی، جینی، سکھ، بودھ وغیرہ۔ آپ اگر اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو آپ یہ کریں کہ ماہنامہ الرسالہ میں پچھلے دس سال کا خبر نامہ پڑھیں۔ آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں کن لوگوں کے جلسوں میں جاتا ہوں۔ جو لوگ میرے بارے میں مذکورہ قسم کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ بلاشبہہ ایک فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ آخرت میں ان کی بہت شدید پکڑ ہوگی۔

سوال

قرآن کی آیت ھدی للمتقین (۲:۲) میں لفظ متقین اپنے اصطلاحی معنی میں ہے یا لغوی معنی میں۔ اصطلاحی معنی میں لیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ قرآن متقین بالفاظ دیگر مسلمین کے لئے تو ہدایت ہے، وہ غیر مسلمین کے لئے ہدایت نہیں اور اگر لغوی معنی میں لیں تو اگلی آیتوں میں متقین کی جو تعریف بیان کی ہے کہ وہ لوگ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ تعریفات غیر مسلمین پر کیسے صادق آسکتی ہیں؟۔ کیا ایمان بالغیب اور اقامۃ صلوۃ اور انفاق کو بھی لغوی معنی میں لیکر اس مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن عام طرز کی ایک مجرد تصنیف نہیں۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کے مختلف اجزاء حالات کی نسبت سے نازل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تقریباً ۲۳ سال میں اس کی تکمیل ہوئی۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک بے حد اہم نکتہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہے کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک مصداق خاص ہے جو سبب نزول کے اعتبار سے ہے اور دوسرا اس کا مصداق عام، جو آیت کے توسیعی انطباق سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی ایک مثال سورہ النور کی یہ آیت ہے۔ والذی تولی کبرہ منھم (النور ۱۱) سبب نزول کے اعتبار سے اس آیت کا ابتدائی مصداق قدیم مدینہ کا عبداللہ بن ابی تھا اور آیت کے توسیعی انطباق کے اعتبار سے اس میں ہر وہ آدمی شامل سمجھا جائے گا جو کسی کو بدنام کرنے کے لئے ابن ابی جیسا پست کردار ادا کرے، خواہ وہ کسی بھی زمانے سے تعلق رکھتا ہو۔

اب سورہ البقرہ کی ابتدائی آیتوں کو لیجئے۔ اس کی آیت نمبر ایک سے لے کر آیت نمبر ۷ تک کا خطاب رسول اللہ کے معاصر یہود سے ہے۔ اس کے آیت نمبر ۸ سے لے کر آیت نمبر ۲۰ تک کا تعلق قدیم مدینہ کے منافقین سے ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۱ سے لے کر آیت نمبر ۲۴ تک عام انسانیت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۵ سے اہلِ ایمان کا تذکرہ

شروع ہوتا ہے۔ سبب نزول کے اعتبار سے ان میں سے ہر آیت کا کوئی وقتی مصداق ہوسکتا ہے مگر اسی کے ساتھ ہر آیت کا ایک توسیعی انطباق بھی ہے جو ہر دور کے انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

ذالک الکتاب میں الف، لام عہد کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہی معہود کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہود و نصاریٰ پر جو آسمانی کتابی بھیجی گئیں ان میں ایک آخری آسمانی کتاب کی بشارت موجود تھی۔ قرآن وہی آخری اور محفوظ کتاب ہے۔ مگر اس سے ہدایت اسی کو ملے گی جو اس کی ضروری شرطوں کو پورا کرے۔

مدینہ میں اس وقت جو یہود آباد تھے وہ اپنے آپ کو اپنے نبیوں کی تعلیمات کا حامل بتاتے تھے۔ ان کے یہاں ایمان، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کا وجود بھی پایا جاتا تھا۔ مگر ان کے یہاں اس کی اصل روح غائب ہوچکی تھی۔ فرمایا کہ قرآن اگر چہ سراپا کتاب ہدایت ہے مگر اس کے ذریعہ صرف اس شخص کو ہدایت ملے گی جس کے اندر حقیقی معنوں میں متقیانہ مزاج پایا جاتا ہو۔ 'الذین یومنون بالغیب' جو غیبی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار ہو، جس کے اندر عبادت الٰہی کی روح موجود ہو، نمائشی راستے کے بجائے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، جو اپنی مذہبی عصبیت میں مبتلا نہ ہو۔ جو لوگ اس قسم کی صفات رکھتے ہوں وہ بہت جلد قرآن اور صاحب قرآن کو پہچان لیں گے اور اس سے ہدایت حاصل کریں گے۔

اس کے بعد ان آیتوں کا ایک عمومی اور توسیعی پہلو ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنی ذات میں بلا شبہہ ہدایت ہے مگر اس دنیا میں کسی کتاب سے ہدایت لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہدایت لینے والا ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو۔

متقی کا اصلی اور لغوی مفہوم محتاط (cautious) ہے۔ انسان کی یہی صفت ہے جو اس کو حق کے معاملہ میں سنجیدہ بناتی ہے اور وہ اس کا سچا متلاشی بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی اصل معرفت ہے اور معرفت صرف اس کو ملتی ہے جو دلیل سے ثابت ہوجانے کے بعد اس کو مان لینے کا مزاج رکھتا ہو۔ صلاۃ کی شرط سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے اندر تسلیم ورضا (submission) کی

صفت موجود ہو۔ زکوٰۃ کی اصل حقیقت اپنی ذات میں دوسرے کا حق تسلیم کرنا ہے۔ ہر منزّل کتاب پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی گروہی تعصّبات سے پاک ہو، وہ اپنے مانوس اکابر کے باہر ظہور آنے والے داعیانِ حق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

مصداق عام کے اعتبار سے پانچ بنیادی صفتیں ہیں، یہ صفتیں ہر انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ جو شخص اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھے وہ گویا قرآن سے ہدایت لینے کے لئے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہے۔ جب بھی وہ کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھے گا تو وہ اس کے لئے معرفت حق کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا وہی حال ہوگا جس کا ذکر قرآن کی سورہ المائدہ آیت نمبر ۸۳ میں کیا گیا ہے۔

سوال

انٹرنیٹ پر جو سوالات ہم کو موصول ہوتے ہیں ان کا جواب عام طور پر انٹرنیت کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ انٹرنٹ کے ذریعہ موصول شدہ ایک عمومی سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان مختلف مقامات پر جو جہاد کر رہے ہیں مغربی میڈیا اس کو فنا ٹسزم کہہ کر بدنام کر رہا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ مسلمانوں کی لڑائی عدل (justice) کے حصول کے لئے ہے۔ جب مسلمانوں کو عدل نہ ملے تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ لڑ کر عدل کو حاصل کریں۔ اگر ان کی لڑائی سے امن برہم ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Mahmood H. M. Daya, P. O. Box 14757, Arusha, Tanzania.

جواب

عدل کے حصول کا کوئی تعلق جنگ سے نہیں۔ عدل جب بھی کسی کو ملتا ہے، پر امن تعمیری جدوجہد کے ذریعہ ملتا ہے نہ کہ متشددانہ جنگ کے ذریعہ۔ جنگ کے ذریعہ عدل حاصل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے معاش کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی شخص خودکشی کر لے۔

اسلام کے دور اوّل میں اہل اسلام کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ تھی کہ ان کو مسجد

حرام تک پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔ مگر اس بے انصافی کو ختم کرنے کے لئے رسول اللہ نے جنگ نہیں کی بلکہ صلح اور امن کا معاہدہ کرلیا۔ صلح کے نتیجہ میں وہ پرامن حالات ملے جس میں استحکام کی کوشش کی جاسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرامن کوششوں کے ذریعہ اسلام اتنا مستحکم ہوگیا کہ کسی لڑائی کے بغیر مسجد حرام اور مکہ اہل اسلام کے قبضہ میں آ گیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے تو انھیں جاننا چاہئے کہ اس ناانصافی کا اصل سبب خود مسلمانوں کا داخلی ضعف ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ امن کے حالات پیدا کر کے وہ تعمیری عمل کریں جس سے ان کی داخلی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ اس کے بعد اپنے آپ انھیں انصاف مل جائے گا۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ فطرت کے تمام قوانین کو ایک جملہ میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ میں اس جملہ کو بنیادی نقطۂ نظر بنا سکوں۔ (سید عبدالحفیظ، جلگاؤں)

جواب

فطرت کے قوانین کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے..... حقیقت پسندی۔ عام طور پر لوگوں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میرے موافق ہے وہ درست ہے اور جو میرے خلاف ہے وہ نادرست۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ جو حقیقت واقعہ ہو اس کو صحیح اور درست مانا جائے۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی بنا پر ناکام ہوتا ہے، خواہ وہ بطور خود دوسروں کی سازش کو اس کا ذمہ دار بتاتا رہے۔

سوال

دہلی کے ایک ہفتہ وار ہندی اخبار 'پنچ جنیہ' کے حوالہ سے آپ کے خلاف کچھ باتیں اردو اخبارات ورسائل میں چھپی ہیں۔ مثلاً ماہنامہ البلاغ (بمبئی) کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ میں یہ چھپا ہے کہ مولانا وحیدالدین خاں نے فرمایا کہ ''قرآن مجید میں لگ بھگ ۱۰۰ دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں

جن میں سنسکرت خاص ہے اور یہ کہ محمد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جن چار زبانوں پر عبور حاصل تھا ان میں سنسکرت بھی ایک تھی۔'' (صفحہ ۴۶) اس طرح کی باتیں اور بھی کئی پرچوں میں چھپی ہیں۔ مثلاً دہلی کے روزنامہ قومی آواز کے شمارہ ۹ رجنوری ۱۹۹۹ میں مراسلہ کے کالم میں آپ کی ایک تقریر کے حوالہ سے آپ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ ''قرآن کریم میں ایک سو الفاظ غیر عربی کے شامل ہیں جن میں بڑی تعداد سنسکرت کے الفاظ کی ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم چار زبانوں کے عالم تھے جن میں سے ایک سنسکرت زبان ہے۔'' (صفحہ ۳) یہ بڑی عجیب باتیں ہیں۔ ان کو لے کر کچھ مسلم اخبارات ورسائل میں آپ کے خلاف سخت باتیں چھپی ہیں۔ براہ کرم بتائیں کہ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے؟۔ (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو غیر ذمہ دارانہ صحافت کی پیداوار ہیں۔ اس صحافت کا شکار ہر وہ شخص ہوتا رہا ہے جو ''نیوز'' میں آجائے۔ چنانچہ میرے خلاف بھی مسلم اخبارات ورسائل میں ایسے خطوط اور مضامین چھپتے رہے ہیں جو سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ میں ان کے بارے میں عام طور پر خاموشی کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور مراسلہ نگاروں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ اس سے پہلے ایک بار قومی آواز میں میرے خلاف ایک بے بنیاد بات چھپی۔ اس کی تردید میں میں نے ایک مراسلہ بھیجا جو قومی آواز (۵ مارچ ۱۹۹۵) میں چھپا۔ میرے جوابی مراسلہ کو دیکھ کر تبلیغی جماعت کے معروف بزرگ مولانا اظہار الحسن صاحب مرحوم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں مجھے خاموشی کے اصول پر برقرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر درج کیا تھا:

اشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے سئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

برائی کرنا برا ہے۔ مگر برائی کرنے والے
سے نفرت کرنا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ (الرسالہ اگست ۸۸)

سوال

آج کل دستور ہند میں تبدیلی کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کوئی تبدیلی کی موافقت میں رائے دیتا ہے اور کوئی اس کی مخالفت میں۔ اس معاملہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟۔ براہ کرم مطلع فرمائیں۔

(وودو ساجد، نئی دہلی)

جواب

دستور ہند میں تبدیلی کی بحث میں ایک رائے یہ سامنے آرہی ہے کہ دستور میں تبدیلی ہونی چاہئے اور دوسری رائے یہ ہے کہ دستور میں تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں تیسری رائے کا بھی امکان ہے اور وہ یہ کہ دستور ہند میں تبدیلی بے فائدہ ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ دستور ہند میں تبدیلی کیوں؟ ۱۹۴۷ کے بعد جب یہ دستور بنا تو اس وقت ملک کے انتہائی اعلیٰ ذہن دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے لمبی بحث اور گفتگو کے بعد یہ دستور بنایا۔ اب کیا ان سے زیادہ بہتر دماغ ہمیں حاصل ہو گئے ہیں جو اس سے اچھا دستور بنا سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پھر تبدیلی کس لئے۔

دوسری بات یہ کہ دستور میں تبدیلی ہمارے قومی مسائل کا حل ہے، اس کا دعویٰ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اگر دستور کی ترمیم سے مسئلہ حل ہوتا ہو تو اب تک اس کو حل ہو جانا چاہئے تھا، کیوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران اس میں ستر بار سے زیادہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پھر ایک اور ترمیم سے یہ مسئلہ کیسے حل ہو جائے گا۔

تیسری صورت ترمیم برائے ترمیم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اور بھی زیادہ بے معنی ہے۔ کوئی بھی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ ترمیم ایک مسلسل عمل ہے جس کو ہر حال میں جاری رہنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اصل سوال یہ نہیں ہے کہ دستور میں ترمیم کی ضرورت ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ ترمیم کے باوجود یہ ضرورت کیوں باقی ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ ترمیم کے باوجود ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ ہے تعلیم میں ملک کا پچھڑا پن۔ تعلیم انسان کو باشعور بناتی ہے اور اس

کے اندر اصلاح کی قبولیت پیدا کرتی ہے۔ جب تک یہ ابتدائی کام نہ ہو، کوئی دوسری تدبیر ہمارے مسائل کو حل کرنے والی نہیں۔

سوال

ہم لوگوں نے ہندو مسلم میل ملاپ کا ایک منچ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں ہم کو مارگ درشن کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سب مذاہب ایک ہیں۔ جیسے رام ویسے محمد۔ یہ بات دونوں مان لیں تو آپس میں اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا۔ (بلراج ملک اور وجے آنند، پانی پت)

جواب

ہندو مسلم میل ملاپ کا مقصد بہت اچھا ہے۔ مگر 'سب مذاہب ایک ہیں'' کے نظریہ سے یہ مقصد حاصل ہونے والا نہیں۔ اس لئے کہ یہ بات اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ مثلاً ہندو عقیدہ کے مطابق۔ رام خدا کے اوتار تھے، یعنی ان کی صورت میں خود خدا مجسم ہو کر آیا۔ مسلمان اوتار واد کے اس عقیدہ کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک محمد ﷺ ایک انسان تھے جن پر خدا نے اپنی وحی بھیجی۔ ایسی حالت میں دونوں کو ایک کہنے سے جس چیز کو فروغ ہوگا وہ منافقت (hypocrisy) ہے نہ کہ فرقہ وارانہ میل ملاپ۔

ہندو مسلم میل ملاپ کا منچ بنانے کے لئے مفید طریقہ یہ ہے کہ اس کو سیکولر پیٹرن پر بنایا جائے نہ کہ کسی مذہبی پیٹرن پر۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کانگریس کے لوگ جو اسٹیج بناتے تھے اس پر ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی کافی تعداد میں آتے تھے۔ مگر آج ہندوتو کو ماننے والے جو اسٹیج بناتے ہیں اس پر زیادہ تر صرف ایک فرقہ کے لوگ آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہندوتو والا اسٹیج بناتے ہیں وہ وہاں سرسوتی دیوی کی وندنا کرتے ہیں اور کھڑے ہو کر بندے ماترم گاتے ہیں۔ مسلمان چونکہ ان چیزوں سے بھڑکتے ہیں اس لئے وہ ایسے اسٹیج پر اکٹھا نہیں ہوتے۔ جب کہ کانگریس کے اسٹیج پر اس قسم کی مذہبی رسمیں نہیں تھیں بلکہ وہ بالکل سیکولر انداز میں ہوتا تھا۔ اس لئے وہاں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی یکساں طور پر شریک ہوتے تھے۔

اگر آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک منچ بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسی چیزوں سے بچنا ہوگا جو دونوں کے لئے حساس اشو (sensitive issue) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ اپنے منچ پر یہ کہیں کہ اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو ڈھا کر وہاں دوبارہ بابری مسجد بنائی جائے تو ایسے منچ پر مسلمان تو آ سکتا ہے مگر وہاں ہندو نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے منچ پر یہ کہیں کہ جانوروں کا ذبیحہ بالکل ختم کر دیا جائے تو ایسے منچ پر ہندو آ سکتے ہیں مگر وہاں مسلمان نہیں آئے گا۔ اس لئے آپ کو دونوں فرقوں کے میل ملاپ کا منچ بنانا ہے تو آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس قسم کے حساس اشو کو نظر انداز کریں اور صرف ان باتوں کو لیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً امن، باہمی محبت، سوشل جسٹس، تعلیم، ملک کی مادی تعمیر، سماج سدھار وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں ہندستان کے لئے وہی قابل عمل ہے جو یورپ اور امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس معاملہ کا ایک عملی فارمولا دریافت کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پرائیویٹ دائرہ میں ہر آدمی کے لئے مذہب کی مکمل آزادی اور اجتماعی دائرہ میں مشترک مفاد والی باتوں پر زور دینا۔ موجودہ حالات میں ہم کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک فرقہ وارانہ میل ملاپ یا مذہبی ہم آہنگی کا بہترین قابل عمل فارمولا یہ ہے کہ ایک پر عمل کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one, and respect all.

برصغیر ہند کے تقریباً ۱۵ ملین ہندو اور مسلمان امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہاں دونوں کے درمیان کوئی مذہبی جھگڑا نہیں۔ دونوں نے بڑی تعداد میں مسجد اور مندر بنائے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے انداز پر اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرتا ہے۔ پھر اگر امریکہ میں ہندو اور مسلمان مذہبی یکسانیت کے فارمولا کے بغیر اتحاد کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو یہی چیز ہندوستان میں کیوں ممکن نہیں۔

سوال

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور اس کا مصنف ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی سزا سخت ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟۔
(نکہت کاظمی، نئی دہلی)

جواب

اسلام کی تعلیمات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں اس طرح کے معاملات کو اسلام میں جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ رزلٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم باطل معبودوں کو برا نہ کہو ورنہ لوگ جہالت کی بنا پر خدا کو برا کہنے لگیں گے (الانعام ۱۰۸) یہی وجہ ہے کہ قدیم مدینہ کے سب سے بڑے گستاخ عبداللہ بن ابی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت کے باوجود قتل نہیں کرایا۔ اس کی وجہ آپ نے یہ بتائی کہ اگر میں ایسا کروں تو وہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی اپنی طبعی موت مرا اور اس کو قتل نہیں کیا گیا، حالانکہ اس وقت عبداللہ بن ابی کو قتل کرنا بالکل آسان تھا۔

سلمان رشدی کے خلاف قتل کا فتویٰ ۱۷ فروری ۱۹۸۹ کو دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو اب تقریباً ۱۲ سال ہو رہے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس فتویٰ نے صرف الٹا نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں بڑے پیمانے پر اسلام کی بدنامی ہوئی۔ اسلام کو نفرت اور تشدد کے مذہب کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس کتاب کے خلاف فتویٰ اور شور وغل سے اس کے مصنف کو تو زبردست فائدہ حاصل ہوا، جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف اس کا نقصان آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ میڈیا کا دور تھا اور جدید میڈیا کے دور میں یقیناً وہی ہونے والا تھا جو عملاً پیش آیا۔

سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب تصنیفی اعتبار سے اس قدر لغو اور غیر دلچسپ ہے کہ شاید کوئی بھی شخص اس کو شروع کر کے ختم

نہیں کرسکتا۔ عام حالت میں وہ ایک ایسی کتاب تھی جو اپنی لغویت کی بنا پر اپنے آپ مرجاتی۔ اس کو نہ کوئی خریدتا اور نہ اس کو کوئی پڑھتا۔ مگر مصنف کے قتل کے فتویٰ کے بعد جب میڈیا میں اس کا چرچا ہوا تو فطری طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس طرح ایک ناقابل مارکیٹ کتاب بھی قابلِ مارکیٹ (marketable) کتاب بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح ترین حل یہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا جاتا اور اس طرح یقینی طور پر وہ اپنے آپ مرجاتا۔ اس طرح کے مسئلہ کا صحیح ترین حل وہ ہے جو اسلام کے خلیفۂ ثانی عمر فاروق کے ایک قول میں ملتا ہے۔ انھوں نے کہا: امیتوا الباطل با لصمت عنه ۔ یعنی باطل کو ہلاک کرو اس پر چپ رہ کر:

Kill the falsehood by observing silence over it.

سوال

آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ سارے لوگ آپ کی بولی بول رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کا نام لئے بغیر آپ کی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ میثاق (اپریل ۲۰۰۰) میں پاکستان کی تنظیمِ اسلامی کے امیر کا مفصل خطاب چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے صلح حدیبیہ کی پالیسی کی حمایت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ ''بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے طرز کی مفاہمت'' ہمارے مسئلہ کا حل ہے۔ حالانکہ یہ صاحب پہلے آپ کے مخالف تھے اور جوش وخروش کے ساتھ مسلح جدوجہد (armed struggle) کی بات کیا کرتے تھے۔ یہی بات دوسرے اکثر لکھنے اور بولنے والوں میں دیکھی جارہی ہے۔ اس طرح آپ کے اعتراف کے بغیر تقریباً تمام لوگوں نے آپ کے نقطۂ نظر کو مان لیا ہے۔ اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے؟۔ (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ بات عملی طور پر اطمینان بخش ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اب عام طور پر حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کررہے ہیں۔ مگر میرے لئے اس میں بہت زیادہ خوشی کی بات

نہیں ۔ میں حدیبیہ کی وکالت بطور ایک اصول کرتا رہا ہوں ۔ مگر یہ حضرات اس کو ایک مجبورانہ عمل کے طور پر اختیار کر رہے ہیں ۔ مثلاً ماہنامہ میثاق کے مذکورہ خطاب میں حدیبیہ پالیسی کی وکالت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے طرز کی مفاہمت کرنی چاہئے (۲۵) پاکستان جس مسئلہ سے دوچار ہے اس کا علاج صلح حدیبیہ ہے (۱۵) پاکستان کے لئے جنگ جیتنا ممکن نہیں کیوں کہ پاکستان سے کہیں زیادہ ایٹم بم بھارت کے پاس موجود ہیں (۲۲)۔

جہاں تک میرا تعلق ہے ، میں جو کچھ کہتا ہوں ، بطور اصول کہتا ہوں نہ کہ بطور مجبوری ۔ صبر میرے نزدیک ایک اعلیٰ اصول ہے نہ کہ مجبورانہ روش ۔ اسی طرح صلح حدیبیہ میرے نزدیک ایک اعلیٰ اسلامی اصول ہے ، وہ کوئی مجبورانہ پالیسی نہیں ۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ جب مجبوری کی فضا نہ ہو تو مسلح تصادم کی باتیں کی جائے اور جب مجبوری کی حالت پیش آجائے تو صلح حدیبیہ کا وعظ شروع کر دیا جائے ۔ صلح حدیبیہ میرے نزدیک دعوتی عمل کو موثر طور پر جاری رکھنے کی ایک حکیمانہ تدبیر ہے نہ کہ کسی قسم کی مجبورانہ روش ۔

سوال

میں آپ کے الرسالہ کا خریدار ہوں ۔ ایک حدیث کی وضاحت چاہتا ہوں ۔ حدیث یہ ہے: اذان کے وقت کی دعا قبول ہوتی ہے کیا مطلب ہے ؟ ۔ کیا باقی اوقات میں اللہ تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتا ؟ ۔ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط ہے یا مشکوک ہے ۔ معلوم کریں ۔ (محمد موسیٰ ، مانوی ، Pin - 584123)

جواب

آپ نے حدیث کا ذکر کیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامۃ فادعوا (مسند احمد ، الترمذی ، کتاب الصلاۃ) یعنی اذان اور اقامت کے درمیان کی دعا رد نہیں ہوتی ، پس تم اس وقت اللہ سے دعا کرو ۔ اس حدیث میں جو بات وقت کے حوالہ سے کہی گئی ہے وہ دراصل کیفیت کے حوالہ سے مقصود ہے ۔ اذان کو سن کر مومن کے اندر یاد خدا کی کیفیات پیدا ہوتی ہے ۔ اس بنا پر اس وقت کی دعا میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو قبولیت کی علامت ہے ۔

اس حدیث کا خطاب اس مومن سے ہے جس نے مسجد سے اذان کی آواز سنی اور پھر اس کے دل میں وہ ربانی جذبات پیدا ہونے لگے جن کا اعلان اس وقت موذن کر رہا تھا۔ وہ اللہ کی کبریائی اور اسکی عظمت کے احساسات سے بھرا ہوا مسجد میں آیا۔ یہاں اس نے وضو کر کے اپنے کو پاک کیا، یہاں تک کہ اس کی زبان سے نکلا: رب اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین۔ اس کے بعد وہ مسجد کے خدا پرستانہ ماحول میں داخل ہوا اور سنت کی رکعتیں ادا کر کے اللہ کی یاد کو اپنے دل میں تازہ کیا۔ اس طرح اذان اور اقامت کے درمیان وہ ایک ایسا انسان بن گیا جو ایمانی جذبات سے سرشار تھا اور نفسیاتی اعتبار سے اس قابل بن چکا تھا کہ اس کی زبان سے ایسے پاکیزہ کلمات نکلیں جو سیدھے اللہ تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ انسان ہے نہ کہ وقت جس کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اے بندے خدا سے دعا کر، کیوں کہ اس وقت تو جس حال میں ہے اس حال میں کی ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔

یہاں دعا کا مطلب دعا کے الفاظ منھ سے بول دینا نہیں ہے بلکہ دعا کا حقیقی عمل کرنا ہے۔ دعا کا عمل یہ ہے کہ آدمی جذبۂ احتیاج کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ ایک طرف اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کو یاد کر کے وہ اس کو پکارے۔ جب ایک بندہ اس عملِ دعا کے لئے بیٹھے تو اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت اس عمل کے لئے اسی طرح انتہائی معاون ثابت ہوگا جس طرح گرمی کا موسم لکڑی میں آگ لگانے کے لئے معاون ہوتا ہے۔ جس طرح گرمی کے ماحول میں جلانے کا عمل کیا جائے تو لکڑی فوراً آگ پکڑ لیتی ہے اسی طرح جب اذان اور اقامت کے درمیان پُر اثر ماحول میں ایک شخص دعا کا عمل کرے تو اس کے اندر وہ کیفیات امنڈ پڑتی ہیں جو اس کی دعا کو حقیقی معنوں میں بندے کی پکار بنا دیں۔ جو اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو وہ ربانی الفاظ بنا دیں جس کے بعد دعا کی قبولیت کا معاملہ ٹھیک ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے گرمی کے موسم میں لکڑی کو جلانا۔ سخت گرمی کے موسم میں دیا سلائی جلاتے ہی لکڑی آگ کو پکڑ لے گی اسی طرح اذان اور اقامت کی درمیان پُر اثر فضا تیار ہو جاتی ہے جب کہ بندہ کی زبان

سے حقیقی دعا نکلے اور اس کا رب اس کو فوراً قبول کر لے۔

سوال

آپ نے الرسالہ مئی ۲۰۰۰ میں لکھا ہے کہ الجزائر کے اسلام پسندوں کو بندوق اٹھانے کے بجائے اسلامی دعوت کا کام کرنا چاہئے۔ گویا کہ آپ اسلام کو سیاست سے دور رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی شاعر کے بقول: جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔
(م۔ا۔ معراج، ناندیڑ)

جواب

مسئلہ دین کو سیاست سے جدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ دین کو چنگیزی سے جدا کرنے کا ہے۔ دین کے نام پر سیاست چلانا خود چنگیزی کی بدترین قسم ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاست سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دین نہیں ہے بلکہ سیاسی ہنگامہ آرائی، تشدد اور باہمی جنگ وجدال ہے۔ جس کا نمونہ آج ہر اس جگہ نظر آتا ہے جہاں نام نہاد اسلام پسند اسلام کے نام پر اپنی سیاست چلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین جب جدا ہوتا ہے تو سیاست سے جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ انسان کے دل سے جب اللہ کا خوف نکل جاتا ہے تو اس کی سیاست اور غیر سیاست سب چنگیزی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو انسان اللہ کی پکڑ کا اندیشہ رکھتا ہو اس کی سیاست بھی رحمت ہوگی اور اس کی غیر سیاست بھی رحمت۔

سوال

آپ کے خیال میں علم وفکر کی فوقیت عمل پر ہے جیسا کہ عام خیال ہے کہ عمل پہلے ہے اور فکر بعد میں۔ اسلام کی روشنی میں واضح فرمائیں۔ (طارق اشفاق، علی گڑھ)

جواب

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کامن سنس ہی اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ کوئی بھی آدمی جو کوئی بڑا عمل کرتا ہے، اس کے عمل کا آغاز فکر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر فکر کی سطح پر ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ خارجی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہی معاملہ

ایمان وعمل کا بھی ہے۔ اسلام میں بھی خارجی عمل کا اصل سرچشمہ داخلی ایمان ہے۔ کسی آدمی کے اندر جتنا گہرا ایمانی شعور پیدا ہوگا، خارجی دنیا میں اتنا ہی زیادہ اس سے عمل کا اظہار ہوگا۔

سوال

کیا مادیت اپنے زوال کے بعد از سرنو عروج کو پہنچے گی؟ کیا جدید مادیت کا زوال ہو رہا ہے؟ اگر زوال ہو رہا ہے تو اس کی علامتیں کیا ہیں اور اگر زوال نہیں ہو رہا ہے تو آئندہ کب اس کا زوال ہوگا؟۔ کیوں کہ فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ: ہر کمالے را زوال (طارق اشفاق، علی گڑھ)

جواب

مٹیریلزم کے دو مطلب ہیں۔ فلسفیانہ معنوں میں مٹیریلیزم خدائی مذہب کے بالمقابل ایک اور مذہب کی حیثیت رکھتا ہے جو صرف مادہ کو واحد حقیقت مانتا ہے۔

In philosophy, the doctrine that matter is the only reali ty and that everything in the world, including thought, will, and feeli ng, can be explained only in the terms of matter.

(Webster's , p. 1110)

میٹریلزم اس مفہوم میں عملاً اب ختم ہو چکا ہے۔ جدید سائنس نے میٹر کے اس تصور کو مکمل طور پر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے جس کے اوپر مادی فلسفہ کا نظریہ قائم تھا۔ میٹریلزم کے لئے اب کوئی نظریاتی بنیاد نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب، ''مذہب اور سائنس''۔

میٹریلزم کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو عملی طور پر لوگوں کے اندر قائم ہے یعنی مادی خوشی یا مادی فائدے کو سب کچھ سمجھنا۔ مادی ترقی کو زندگی کا مقصد قرار دینا۔ اس دوسرے مفہوم میں میٹریلزم ہر دور میں تھی اور آج بھی وہ پوری طرح زندہ ہے۔ بیشتر لوگ اس کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اس دوسرے مفہوم میں میٹریلزم کبھی مرنے والا نہیں۔ وقتی لذت یا وقتی خوشی کا فریب اتنا زیادہ پرکشش ہے کہ آدمی اس کے سحر سے نجات نہیں پائے گا۔ اس لئے وہ کبھی اس مفہوم میں میٹریلزم کو نہیں چھوڑے گا۔

جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے ، وہ میرے نزدیک مستقل بالذات کوئی چیز نہیں ۔ انسانوں کی مادیت پسندی اجتماعی صورت اختیار کر کے تہذیب بن جاتی ہے ۔ میرے نزدیک تاریخ کی ہر تہذیب بنیادی طور پر مادی تہذیب ہی تھی اس لئے اگر ایک مادی تہذیب مٹے تو عملاً صرف یہ ہوگا کہ اس کی جگہ دوسری مادی تہذیب غالب آجائے گی ۔ اس دنیا میں فرد کی حیثیت سے غیر مادی انسان کا وجود تو ممکن ہے مگر اجتماعی معنوں میں کسی ایسی انسانی تہذیب کا قائم ہونا شاید ممکن نہیں جو مجموعی معنوں میں غیر مادی اصول پر قائم ہو۔

سوال

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارے میں سنجیدہ لوگ عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی سوچ کے اعتبار سے جذباتی ہو گئے ہیں ۔ ان کے اندر حقیقت پسندانہ مزاج موجود نہیں ۔ جب کہ کسی بھی ترقی کے لئے غیر جذباتی سوچ اور حقیقت پسندانہ مزاج لازمی طور پر ضروری ہے ۔ موجودہ مسلمانوں کا یہ مزاج کیسے بنا اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ ۔

(ڈاکٹر کے ۔ عبدالستار، مدراس)

جواب

میرے نزدیک اس غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا آغاز زیادہ نمایاں طور پر انیسویں صدی میں ہوا ۔ اس زمانہ میں مغربی قومیں مسلم علاقوں میں داخل ہو گئیں ، انھوں نے تقریباً ہر جگہ براہ راست یا بالواسطہ انداز میں سیاسی اور تہذیبی طور پر غلبہ حاصل کر لیا ۔

یہ وقت معاملہ کی تشخیص کا تھا ۔ بدقسمتی سے اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے معاملہ کی غلط تشخیص کر کے مسلمانوں کی سوچ کو غلط رخ پر ڈال دیا ۔ ان حضرات نے مسلمانوں کو بتایا کہ اس واقعہ کے پیچھے تمام تر مغربی قوموں کی سازش اور ان کی دشمنی ہے ۔ جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ مسلمان اب اپنے دور زوال میں پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف مغربی قومیں تازہ دم قوتوں سے مسلح ہو کر آ رہی تھیں ۔ اس کے بعد جو کچھ قانون فطرت کے تحت ہوا وہ عین وہی تھا جو مقابلہ کی اس دنیا میں ہمیشہ پیش آتا ہے ۔

اس وقت مسلم رہنماؤں کو چاہئے تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ قانون فطرت کے تحت ہوا ہے اور خود تمہاری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے تو مسلمانوں میں تعمیر خویش کا جذبہ جاگ اٹھتا مگر جب انہوں نے اس معاملہ کو اغیار کی سازش اور دشمنی کا نتیجہ قرار دیا تو مسلمانوں میں غیر قوم کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورا مسلم معاشرہ منفی سوچ کا شکار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو آپ نے جذباتی سوچ کا نام دیا ہے۔

اس طرح تقریباً دو سو سال پہلے مسلمانوں کے اندر جذباتی طرز فکر شروع ہوا۔ وہ بڑھتے بڑھتے پوری مسلم ملت پر چھا گیا۔ اب ضرورت ہے کہ اس جذباتی طرز فکر کو توڑا جائے اور لوگوں میں حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔ مگر یہ کام ایک بھاری قربانی چاہتا ہے اور وہ قربانی شخصی مقبولیت کی قربانی ہے۔ جو آدمی اس مزاج کو ختم کرنے کے لئے اٹھے گا یقینی طور پر وہ مسلمانوں میں غیر مقبول ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے فہیم حضرات مصلحت کا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مزاج کو توڑنے کے بجائے اس کو وہ غذا دے رہے ہیں جو اس کو پسند ہے تا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر غیر مقبول ہونے سے بچائیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنی مقبولیت کی موت کے اوپر مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد رکھ سکے۔ جو مسلمانوں کی جذباتیت کو ختم کر کے ان کو حقیقت پسند بنائے، جو آدمی جذباتی تسلسل کو توڑنے کی کوشش کرے گا، ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی پہلی نسل میں غیر مقبول ہو جائے مگر یہی وہ حوصلہ مند شخص ہے جو اپنی ذاتی قربانی کی بنیاد پر ملت کے مستقبل کی تعمیر کرے گا۔ تاریخ کو ایسے ہی ایک بہادر انسان کا انتظار ہے۔

لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لئے
اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ (الرسالہ اکتوبر ۸۸)

سوال

الرسالہ جنوری ۲۰۰۰ میں ایک مضمون ''مستقبل کی قیادت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ ''ملک کے **upper cast** (ہندو) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے اس میں اونچی ذات والوں کیلئے تو باعزت جگہ ہے، مگر نیچی ذات اور غریب عوام کیلئے اس میں کوئی باعزت جگہ نہیں'' مگر مسلمانوں میں بھی اسی طرح کی تفریق وکمزوری ہے، وہ کس آئیڈیالوجی یا سسٹم کے تحت ہے؟۔ اس گمبھیر معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (انوار الحق، شیخ پورہ)

جواب

برادرانِ وطن کے اندر اونچی ذات اور نیچی ذات کی جو تقسیم ہے وہ ان کے مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہے، اس کو ورن آشرم کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف خود ہندوؤں کے بڑے بڑے اہل علم نے کیا ہے، مثال کے طور پر دادا صاحب کالیلکر۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں آج جو تفریق نظر آتی ہے وہ ایک عملی تفریق ہے۔ وہ مسلمانوں کے اپنے قومی تنزل کے سبب سے وجود میں آئی ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے نہ کہ اسلام پر۔ مسلمانوں کی موجودہ تفریق کو مسلمانوں کی اصلاح کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے مگر برادران وطن کے درمیان جو تفریق ہے وہ اس وقت ختم ہوگی جب کہ خود ان کے مذہب میں ریفارم لایا جائے۔

سوال

میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میرے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا ہے کہ میں دعوت کا کام کروں۔ میری آرزو ہے کہ اپنی ڈگری لینے کے بعد میں کسی ایسے جامعہ میں داخل ہو جاؤں جو اس دور کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو اور لوگوں کو تذکیر وتبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بناتا ہو۔ (محمد سعید، پاکستان)

جواب

دعوت کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کا جذبہ بے حد قیمتی ہے۔ مگر پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک میں تعلیم وتربیت کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو ایک آدمی کو داعی کامل بنائے۔ داعی خود اپنی

کوششوں سے بنتا ہے نہ کہ کسی ادارہ کی تعلیم وتربیت سے۔

پاکستان میں دعوتی کام کے عظیم مواقع موجود تھے مگر وہاں کے اسلام پسند رہنماؤں کی ایک غلط فکر نے سارے امکان کو تباہ کر دیا۔ وہ فکر یہ کہ اسلامی دعوت کا کام اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوجائے۔ اس غلط سوچ نے پاکستان کی اسلامی تحریک کو عملاً سیاسی تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔ بہترین مواقع کے ہوتے ہوئے وہ کوئی مثبت دعوتی کام نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام اسلامائزیشن آف مین تھا مگر ان لوگوں نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ نہ صرف ایک غیر اسلامی نشانہ تھا بلکہ وہ اللہ کی ناقدری بھی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور میڈیا اور کمیونی کیشن اور انٹرنٹ نے دعوت کے مواقع کو ہزاروں گنا زیادہ وسیع پیمانہ پر ہمارے لئے کھول دیا ہے۔ ایسے دور میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا صرف ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی ناقدری ہے۔ اللہ نے کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع کھول کر ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کے پیغام کو ساری دنیا تک پہنچا سکیں۔ پیغام رسانی کے اس کام میں آج کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا گویا اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سیاست ایک ایسا جرم ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ مواقع کو تباہ کرنا اور تخریبی نشانوں پر قوم کو دوڑانا ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔

آپ جیسے نوجوانوں کو میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے حالات کے اعتبار سے دعوت کا کام شروع کر دیں۔ آپ کا دعوتی کام ہی آپ کے لئے وہ تربیت گاہ بن جائے گا جہاں آپ کو فطری عمل کے دوران دعوتی تربیت ملتی رہے۔ دعوت ہمیشہ حقیقی تجربہ کے دوران سیکھی جاتی ہے نہ کہ کسی رسمی کورس کے ذریعہ۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (البقرہ ۲۸۲) اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ علم کا اصل سرچشمہ تقویٰ ہے۔ آدمی کا اخلاص اور اس کا خوف خدا، دیانتداری اور شفقت علی الخلق اور مسئولیت کا احساس، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کے لئے علم و آگہی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔

تقویٰ کا تعلق علم سے یہ ہے کہ تقویٰ آدمی کے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کو زیادہ گہرے غور و فکر کے قابل بنا دیتا ہے۔

سوال

۱۹۴۷ سے پہلے جب دیش کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا تو اس علاقہ کے بیشتر مسلمان یہ کہتے تھے کہ آزادی کے بعد جو اکھنڈ انڈیا بنے گا اس میں غیر مسلموں کی مجارٹی ہوگی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنی پولیٹکل اور کلچرل پہچان کو باقی رکھتے ہوئے زندگی گزاریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک الگ مسلم لینڈ ہو۔ مگر جب یہ مسلم لینڈ بن گیا تو سین (scene) دوسرا تھا۔ اب یہاں کا حال یہ ہوا کہ جس کو موقع ملا وہ بھاگ بھاگ کر انہیں ملکوں میں پہنچ گیا جہاں ان کے نظریہ کے مطابق غیر مسلم غلبہ قائم تھا۔ چنانچہ آج بڑی تعداد میں مسلمان انہیں مغربی ملکوں میں جاکر آباد ہوگئے ہیں جہاں غیر مسلم تہذیب کا پوری طرح ڈامینیشن (domination) ہے۔ کیا یہ ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں؟۔ کیا اسلام ہم کو یہی سکھاتا ہے؟۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالرحمن ایم۔اے، نانڈیر)

جواب

یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمانوں کی سوچ یہی تھی۔ اس زمانہ میں جو لوگ یہ کہتے تھے کہ مذہب اور قومیت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، مذہب کا تعلق عقیدہ سے ہے اور قومیت کا تعلق ہوم لینڈ سے، ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایسے افراد کا اس زمانہ میں مسلم سماج کے اندر عزت کے ساتھ رہنا سخت دشوار ہوگیا تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو میں نے نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ذاتی طور پر اس کا تجربہ کیا ہے۔

یہ بھی ایک معلوم واقعہ ہے کہ جب ایک ہنگامہ خیز تحریک کے بعد ایک الگ مسلم لینڈ بن گیا تو یہی لوگ پہلے خود اس مسلم لینڈ میں اپنی مادی ترقی کی کوشش میں لگ گئے اور جب دیکھا کہ اس مسلم لینڈ میں زیادہ بڑی ترقی کے امکانات نہیں ہیں تو وہ بھاگ بھاگ کر ان ملکوں میں پہنچنے لگے جن کو مادی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک (developed countries) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آج انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، حیدرآباد اور کشمیر کے ۱۰ ملین (ایک کروڑ) سے زیادہ مسلمان یہاں سے جا کر امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں چین اور سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں بلکہ وہ زبان حال یا زبان قال سے اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا اور اپنے بچوں کا مادی مستقبل شاندار طور پر ان سیکولر ملکوں میں محفوظ کر لیا۔

یہ معاملہ بلاشبہہ ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ان مسلمانوں نے اپنی علیٰحدہ تہذیبی شناخت کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ انہوں نے اس معاملہ میں یہاں کی غیر مسلم اکثریت سے کسی بھی مصالحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی جو متحدہ قومیت کے قائل تھے، ان کو شیخ الاسلام کے بجائے شیخ الاصنام کہا گیا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کو شوبوائے کا نام دیا گیا، وغیرہ۔

ان مسلمانوں نے یہاں ایسی دھواں دار تحریک چلائی کہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بہت بڑے پیمانہ پر نفرت اور کشیدگی کی فضا قائم ہوگئی۔ دونوں کے درمیان تعلقات کی اس تلخی نے اس پورے علاقہ میں دعوت کے مواقع کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ نیز یہ کہ اس نام نہاد اسلامی تحریک کے نتیجہ میں انڈیا کے تقریباً بیس کروڑ مسلمان مزید اضافہ کے ساتھ عین اسی خطرہ میں زیادہ شدت کے ساتھ پھنس کر رہ گئے جس خطرہ سے بچنے کا نام لے کر علیٰحدہ مسلم لینڈ کی تحریک چلائی گئی تھی۔

یہ بلاشبہہ ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام مسلمان ایک مجرمانہ فعل کے مرتکب ہوئے ہیں جنہوں نے علیٰحدہ تہذیبی شناخت کے نام پر یہ ہنگامہ کھڑا کیا تھا اور اب نہایت اطمینان کے ساتھ اسی قسم کی سیکولر تہذیب سے موافقت کر کے اس کے اندر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

اسلام کے مطابق ، ایسے مسلمانوں کے لئے ان کی موجودہ پرسکون زندگی کا کوئی مبّرر (justification) موجودنہیں۔ان لوگوں کے لئے جائزطور پرصرف دو میں سے ایک کا انتخاب (option) ہے۔یا تو وہ دوبارہ اپنے حاصل کردہ ''مسلم لینڈ'' میں واپس جائیں اور وہاں کی سختیوں اور تلخیوں کو برداشت کرتے ہوئے وہاں زندگی گزاریں۔ان کے لئے دوسرا ممکن انتخاب یہ ہے کہ وہ کھلے طور پر اعلان کریں کہ ان کا سابقہ نظریہ غلط تھا۔ایک مسلمان سیکولر لینڈ میں بھی اسی طرح جائزطور پر رہ سکتا ہے جس طرح مسلم لینڈ میں۔

ان مسلمانوں کی موجودہ حالت گویا تیسرا انتخاب (third option) ہے۔اوراس معاملہ میں تیسرا انتخاب بلاشبہہ کوئی انتخاب نہیں۔یہ اسی دوہرا معیار کی مثال ہے جس کو حدیث میں ''الذی یأتی ھؤلاء بوجہٍ و ھؤلاء بوجہٍ (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ماقیل فی ذی الوجھین) کہا گیا ہے،اس قسم کی دہرا روش اسلام میں اتنی زیادہ مبغوض ہے کہ اندیشہ ہے کہ اس کے ساتھ ''نماز اور روزہ'' بھی غیر معتبر ہو جائے۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اس مجرمانہ فعل کے ذمہ دار صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو براہ راست طور پر اس تحریک کے علم بردار بنے ہوئے تھے بلکہ وہ لوگ بھی یقینی طور پر اس میں شریک قرار دئے جائیں گے جنھوں نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یا اب وہ کھلے طور پر اس نظریہ کی غلطی کا اعتراف نہیں کررہے ہیں۔ایسے موقع پر کسی کا خاموش رہنا ہمیشہ بالواسطہ تائید کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس مسلّمہ اصول کے مطابق ، مذکورہ جرم میں اگر کچھ لوگ براہِ راست طور پر شریک ہیں تو دوسرے لوگ بالواسطہ طور پر شریک ۔ اس جرم عام میں مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو کھلے طور پر اس کی غلطی کا اعلان کریں اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ اس اعلان کا نتیجہ انہیں اپنے ہم قوموں کی طرف سے سخت ردعمل (backlash) کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

سوال

میں فلسفہ کا طالب علم ہوں اور اکثر و بیشتر شکوک وشبہات سے دوچار رہتا ہوں۔ فلسفہ کی طرف میرا طبعی میلان ہے۔ ایک قسم کے شکوک رفع ہوتے ہی دوسرے قسم کے شکوک مجھے آگھیرتے ہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کیا فلسفہ کا مطالعہ ترک کرنا ہوگا؟۔ اکثر لوگوں کا مجھے یہ مشورہ ہے کہ فلسفہ کوئی عملی چیز نہیں، فکری چیز ہے اور فکری پیچیدگیوں میں پڑنا اپنا وقت برباد کرنا ہے۔ اسطرح کی باتوں سے ذہن سازی نہیں ہوتی بلکہ ایمان ویقین کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ (طارق اشفاق، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ)

جواب

اس سوال کا جواب کچھ ممتاز فلسفیوں نے خود ہی کامیاب طور پر دے دیا ہے۔ مثال کے طور پر برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل نے۔ آپ اس کی کتاب علم انسانی (**Human Knowledge**) کو گہری نظر سے پڑھیں تو آپ اس میں اپنے سوال کا جواب پالیں گے۔

اصل یہ ہے کہ فلسفہ کم از کم ۵ ہزار سال سے حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہا ہے مگر اس کو کبھی حقیقت کی دریافت نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس سائنس کو موجودہ زمانہ میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ فلسفہ علم کلّی تک پہنچنا چاہتا تھا جو موجودہ دنیا میں ممکن ہی نہ تھا۔ سائنس نے اسی حقیقت کو دریافت کر کے علم جزئی پر قناعت کر لی اس لئے وہ کامیاب ہوگئی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایکسرے مشین کے سامنے ایک آدمی کو کھڑا کر کے جب مشین کی سوئچ دبائی جاتی ہے تو فوراً ایک پلیٹ پر آدمی کی داخلی تصویر آجاتی ہے۔ اب فلسفی یہ جاننا چاہے گا کہ ایسا واقعہ کیوں کر ہوا۔ چونکہ انسان کی اپنی محدودیتوں (**limitations**) کی بنا پر اس علم تک پہنچنا ممکن نہیں اس لئے فلسفی ابدی طور پر اس میں الجھ کر رہ جائے گا۔ اس کے حصہ میں آخر کار کنفیوزن کے سوا اور کچھ نہ آئے گا۔ اس کے برعکس سائنس نے یہ کیا کہ ''کیوں'' کے سوال کو الگ کر کے ''کیا ہے'' کو لے لیا۔ اس طرح وہ اس میں کامیاب ہوگئی

کہ انسانی تمدن کو ایک قیمتی تحفہ دے سکے۔

اس معاملہ میں حقیقت پسندی کی بات یہ ہے کہ آدمی اجمالی علم پر اکتفا کرے۔ وہ جزئی علم پر راضی ہو جائے اور کلّی علم کے پیچھے بے فائدہ طور پر نہ دوڑے۔ قرآن میں اسی حقیقت کو ایک سوال کے جواب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تم کو اس دنیا میں صرف علم قلیل دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل) اس مضمون کی تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب 'مذہب اور سائنس' کا مطالعہ کریں۔

سوال

ایک حدیث اس طرح ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے خدا کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ اس وقت تک دنیا ختم نہ ہوگی جب تک لوگوں پر ایسا دن نہ آئے گا کہ قاتل کو یہ علم نہ ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا اور مقتول یہ نہ جانے گا کہ میں کیوں قتل ہوا۔ کسی نے عرض کیا کہ ایسا کیوں ہوگا۔ ارشاد فرمایا کہ فتنوں کی وجہ سے قتل بہت بڑھ جائے گا۔ پھر ارشاد فرمایا ان فتنوں میں قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں جہنم میں داخل ہوں گے۔'' اس حدیث میں قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں کے جہنم میں داخل ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ قتل کرنے والا جہنم میں جائے گا یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن قتل ہونے والا جہنم میں جائے گا یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حدیث کا اصل مفہوم کیا ہے؟۔ براہ کرم مطلع فرمائیں۔ (خورشید احمد، شوپیان)

جواب

اس اشکال کا جواب خود حدیث میں موجود ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد صحابہ نے آپ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول قاتل کا جہنم میں جانا تو معلوم ہے مگر مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: کل واحد منهما يريد قتل صاحبه (النسائی، تحریم القتل) یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

قتل کا ایک واقعہ وہ ہے جب کہ قاتل یک طرفہ طور پر مجرم ہو اور مقتول یک طرفہ طور پر

بے قصور۔ مگر جب بگاڑ بڑھ جائے تو معاملہ یک طرفہ (**unilateral**) نہیں رہتا بلکہ دوطرفہ (**bilateral**) ہوجاتا ہے۔ یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے دونوں یکساں طور پر سرکش ہوتے ہیں اورصرف یہ اتفاق کی بات ہوتی ہے کہ اس دوطرفہ سرکشی کے دوران ایک شخص مارا گیا اور ایک شخص بچ گیا۔اس دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ دونوں ہی اللہ کے نزدیک مجرم قرار پائیں گے۔ کیوں کہ اسلام کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ عمل کا دارومدار نیت پر ہے(**انما الا عمال با لنیات**)۔

سوال

قرآن کے مطالعہ سے،معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر نبوت عطا کی گئی۔ لیکن اس وقت ان کو تورات نہیں دی گئی۔ فرعون اور اس کی قوم کے دریائے قلزم میں غرق ہونے کے بعد کوہ طور پر چالیس روز کا اعتکاف کرنے کے بعد ان کو تورات دی گئی۔اس کی صراحت قرآن میں کئی مقام پر آئی ہے۔ایک جگہ ارشاد ہوا ہے'اور ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب عطا کی جو لوگوں کے لئے بصیرت، ہدایت اور رحمت تھی تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں'۔ (القصص ۴۳)اس آیت کے''القرون الاولیٰ'' کے فقرے کے بارے میں ایک تفسیر یہ آئی ہے:یعنی اگلی قوموں سے مراد قوم نوح،قوم عاد،قوم ثمود وغیرہ ہیں۔اور کہا جاتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی گئی۔(**زھدۃ التفسیر من فتح القدیر، للامام الشو کانی ۵۱۲**) نزول تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ودعوت کے اولین مخاطب فرعون اور اس کی قبطی قوم تھی۔اس دعوت کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو کس قسم کی تعلیمات بتاتے تھے اوران کا ذریعہ کیا تھا۔قرآن سے اس کی صراحت نہیں ملتی۔کیوں کہ تورات ان کی ہلاکت کے بعد نازل ہوئی۔کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام وہی چیز ان کے سامنے پیش تو نہیں کرتے تھے جسے ہم شریعت اسلامی میں سنت یا وحی غیر متلو کہتے ہیں؟ میری اس الجھن کو دور فرمائیں۔

(غلام نبی،سری نگر)

جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ وہی ہے جو دوسرے تمام پیغمبروں کا معاملہ تھا۔ مصر میں وہ ابھی دورِ دعوت میں تھے اور دورِ دعوت میں ہر پیغمبر اپنی قوم کو صرف توحید کا پیغام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے بھی فرعون اور قوم فرعون کے سامنے توحید کا پیغام پیش کیا۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے۔ وہ احکام کا مجموعہ ہے۔ اس طرح کے احکام ہمیشہ اس وقت اترتے ہیں جب کہ اس کے موافق معاشرہ بن چکا ہو۔ بنی اسرائیل جو اس وقت کے اہل ایمان تھے، جب وہ صحراء سینا میں آباد ہوئے اس وقت وہاں ان کا معاشرہ قائم ہوگیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے مشن کے اس دوسرے مرحلہ میں تورات کی صورت میں شرعی احکام انہیں دے دئے گئے۔ یہی معاملہ خود پیغمبر اسلام صلی علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ میں آپ مرحلۂ دعوت میں تھے۔ چنانچہ اس وقت آپ مکہ کے مشرکین کو توحید کا پیغام دیتے رہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں جب اہل ایمان کا معاشرہ قائم ہوگیا، اس وقت آپ پر احکام نازل کئے گئے۔

سوال

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ: دنیا بقدر مقدر اور دین بقدر مشقت۔ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں (پرویز اختر صدیقی۔ مہادیو اروڈ، آگرہ)

جواب

اس معاملہ میں صحیح بات یہ ہے کہ دنیا بقدر امتحان اور دین بقدر اخلاص۔ وہ تمام چیزیں جن کو دنیا کہا جاتا ہے وہ سب امتحان کا پرچہ ہیں، مثلاً مال، اولاد، شہرت، مقبولیت، عہدہ اور اقتدار۔ اللہ کو جس چیز میں جس آدمی کا امتحان لینا منظور ہوتا ہے وہ چیز اس کو دے دی جاتی ہے۔ دنیا کی محرومی نہ تو سزا کے لئے ہے اور نہ دنیا کی فراوانی انعام کے لئے۔ دونوں ہی یکساں طور پر امتحان کے لئے ہیں۔

جہاں تک دین کا معاملہ ہے وہ تمام تر اخلاص پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دین کوئی نقشۂ

محنت ہے اور اس نقشہ کے مطابق جو آدمی پریکٹس کرے اس کو پریکٹس کرتے کرتے دین مل جائے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کی نظر آدمی کے اندرونی اخلاص پر ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر جتنا اخلاص ہوتا ہے اسی کے بقدر وہ اللہ کی توفیق سے دین میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ گویا کہ اس معاملہ میں صحیح فارمولا یہ ہے کہ دنیا بقدر امتحان اور دین بقدر اخلاص۔

سوال

باتیں دوطرح کی ہوتی ہیں یا مسائل، نظریات دوطرح کے ہوتے ہیں: (۱) منصوصات (۲) مستنبطات اول الذکر میں کسی کو اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ البتہ مستنبطات، یا مستخرجات میں دائرہ اختلاف وسیع تر ہوتا ہے۔

سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، محدثین تقریباً سبھوں نے اپنے فکر پر دلائل کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اپنے مخالف کے بارے میں اسطرح اعلان کیا ہے: **نحن علی الصواب مع احتمال الخطاء، انتم علی الخطأ مع احتمال الصواب** اور یہ کہ غیر منصوصات پر اصرار کی ایک جانب غیر شرعی چیز ہونے پر فقہاء امت کا تقریباً اتفاق ہے۔

ہر صاحب فکر جسے اللہ نے فکر مستقل سے نوازا ہو۔ اسے یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ **انا علی الصواب مع احتمال الخطأ، انت علی الخطأمع احتمال الصواب** ۔اختیار حق اور احقاق کیلئے راستہ صاف ہے۔ (سید احمد اللہ بختیاری، حیدرآباد)

جواب

راقم الحروف کی تحریریں زیادہ تر منصوصات سے متعلق ہوتی ہیں نہ کہ مستنبطات سے متعلق۔ ایسی حالت میں ان تحریروں پر مذکورہ قسم کے احتمال کا اصول چسپاں نہیں ہوتا۔ مثلاً میں یہ کہتا ہوں مسلمان کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلموں کی حیثیت مدعو کی۔ یہ یقینی طور پر نصی کا مسئلہ ہے نہ کہ استنباط کا مسئلہ۔

موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنما اور مسلم اخبارات ملّی مسائل کو لیکر بار بار ایسی باتیں کرتے ہیں

جن سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ اسکے مقابلہ میں راقم الحروف کا کہنا یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا تعلق داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے معاملات میں غیر مسلموں سے نزاع کو اوائڈ کریں تا کہ وہ معتدل ماحول قائم ہو جس میں دعوت کا پُر امن عمل جاری رہ سکے۔ یہ نظریہ صراحۃً نص قرآنی پر مبنی ہے۔ مثلاً فلا ینازعنک فی الامر وادع الی ربک (الحج ٦٧) ۔ ایسی حالت میں اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے مجھے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ: رأیی صواب یحتمل الخطاء ورأی غیری خطأ یحتمل الصواب.

یہی ہمیشہ خود علماء امت کا موقف رہا ہے۔ وہ مذکورہ قسم کے جملے صرف مستنبطات کے بیان میں لکھتے ہیں نہ کہ منصوصات کے بیان میں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں نماز پانچ وقت کی نہیں ہے بلکہ صرف دو وقت یا تین وقت کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب علماء صالحین اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں رات اور دن کے درمیان پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے مضمون کے آخر میں لکھیں کہ: نحن علی الصواب مع احتمال الخطأ وانتم علی الخطأ مع احتمال الصواب.

البتہ کچھ دوسرے قسم کے مسائل جنکی بنیاد نص پر نہیں ہے بلکہ استنباط پر ہے، ان کے بیان میں علماء مذکورہ قسم کا اعتراف درج کرتے ہیں۔ مثلاً علماء کا ایک طبقہ اگر اصرار کرے کہ جراب پر مسح کی اجازت صرف اس جراب کیلئے ہے جو قدیم طریقہ کے مطابق چمڑے سے بنایا گیا ہو۔ اب دوسرا عالم اگر یہ کہے کہ صنعتی ریشوں سے بنے ہوئے جدید طرز کے موزوں کا بھی وہی حکم ہے اور ان پر بھی مسح جائز ہے، تو اپنے اس بیان کے ساتھ بطور احتیاط وہ مذکورہ قسم کے احتمالی الفاظ لکھ سکتا ہے، کیونکہ یہ دوسری قسم کا بیان استنباط پر مبنی ہے نہ کہ براہِ راست نص پر۔ میں ایسے موقع پر ''غالباً'' جیسا کوئی لفظ استعمال کرتا ہوں۔

میری تحریروں کا دوسرا جزء وہ ہے جس کا تعلق جدید حالات کی نسبت سے تدبیر کار پر ہے۔ مثلاً پُر تشدد جدوجہد کے مقابلہ میں پُر امن جدوجہد۔ جلسہ جلوس کے طریقہ کے بجائے گفت وشنید کا طریقہ،

اختلافی معاملات میں محاذ آرائی کے بجائے حکیمانہ انداز، خارجی اقدام سے پہلے داخلی تیاری وغیرہ۔

یہ دوسری باتیں بھی اپنی اصل کے اعتبار سے منصوصات پر مبنی ہیں۔ البتہ چونکہ ان کا تعلق خارجی حالات سے ہے اور خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان باتوں پر انطباق (application) کے اعتبار سے، ایک سے زیادہ رائیں ہوسکتی ہیں۔ اس پہلو سے ایک شخص یہ حق اختلاف رکھتا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ یہ بتائے کہ حالات کی نوعیت اس کے نزدیک اس سے مختلف ہے جو میں نے اپنے مطالعہ سے سمجھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں خود سنتِ رسول میں مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جن مشرکین سے جنگ کی انہی مشرکین سے حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صلح کرلی۔ اسی طرح آپ نے احد کے موقع پر مدینہ سے تین میل باہر جا کر مخالفین سے مقابلہ کیا اور احزاب کے موقع پر انہیں مخالفین سے مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کیا، وغیرہ۔ اس لئے شریعت کا یہ متفقہ اصول ہے کہ: **تتغير الا حكام بتغير الزمان والمكان۔**

تدبیر کار سے متعلق میری جو تحریریں ہیں وہ اسی آخری نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں مسلمانوں کو جو مشورہ دیا جاتا ہے اس کے ردّ وقبول کی بنیاد یہ ہے کہ حالات کا بے لاگ مطالعہ کر کے ان کی حقیقی نوعیت کو سمجھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن وسنت کے کون سے احکام ان حالات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو مجھ سے اختلاف ہو تو اس کو الزام تراشی اور بہتان طرازی کے بجائے دلائل اور تجزیہ کی زبان میں بتانا چاہئے کہ میری نقطۂ نظر کے بجائے دوسرا نقطۂ نظر قرآن وسنت سے کیوں اس کے نزدیک زیادہ قریب ہے۔

سوال

تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ وہ ہر جگہ مقبول ہو رہی ہے۔ اس کی اس مقبولیت کا راز کیا ہے؟ (عمر فاروق، نیویارک، بذریعہ ٹیلی فون)

جواب

تبلیغی جماعت کے ذریعہ امت کو کچھ فائدہ مل رہے ہیں۔ مثلاً مسجد کے نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا۔ اس لحاظ سے وہ قابل قدر ہے۔ مگر تبلیغی جماعت کا طریقہ ایک اجتہادی طریقہ ہے وہ کوئی منصوص طریقہ نہیں۔ ان کے جلسوں میں قرآن کے بجائے فضائل کی روایتیں سنائی جاتی ہیں جو اکثر سند کے اعتبار سے غیر معتبر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے یہاں کرامت کے قصوں اور کہانیوں کی کثرت ہے جو بے بنیاد بھی ہوتے ہیں اور غیر مسنون بھی، جہاں تک اس کام کی مقبولیت کا معاملہ ہے تو اس کی مقبولیت کا راز زیادہ تر یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے سارے معاملہ کو ایک سمپل روٹین میں ڈھال دیا ہے:

They have reduced Islam to a simple routine.

سوال

آپ کے لفظ (جہاد) کی تعریف میں منسلکات روانہ کئے جارہے ہیں۔ تفصیل اور صبر کے ساتھ پڑھ کر جواب دو۔ قرآن کو خدائی کتاب کہنے والا انسانیت کا دشمن ہے اور سرو دھرم سمبھاو کا بھی دشمن ہے۔ (شیوا گوڑ)

Shiva Goud, B.A. L.L.B. Advocate,

H. No. 6-6-204, Sangareddy-502001

جواب

شیوا گوڑ صاحب نے اپنے اس مکتوب کے ساتھ ہمیں انگریزی میں ۱۴ صفحہ کی فوٹو کاپیاں بھیجی ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں کا جواب یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

۱۔ آپ نے اپنے مکتوب میں قرآن کی ۲۴ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس طرح کی باتیں ہیں کہ ــــــــ ان سے لڑو، ان سے دوستی نہ کرو، ان کے ساتھ نرمی سے نہ پیش آؤ۔ ان کے خلاف جہاد کرو، وغیرہ۔ واضح ہو کہ قرآن کی یہ آیتیں جو آپ نے نقل کی ہیں وہ غیر مسلم کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو نہیں بتاتیں۔ بلکہ وہ دشمن کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو بتاتی ہیں۔ اور کسی کھلے دشمن کے

معاملہ میں یہی ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے۔

ان آیتوں کی بنیاد پر آپ اسلام کے بارے میں جو شدید رائے قائم کی ہے، وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ نے قرآن کی مذکورہ آیتوں کو عمومی معنوں میں لے لیا ہے۔ حالانکہ یہ آیتیں ہنگامی حالات کے لئے ہیں۔ یہ اس وقت کے لئے ہیں جب کہ مسلمانوں اور دوسری قوم کے درمیان حالت جنگ (state of war) قائم ہوگئی ہو اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ حالت جنگ میں ہمیشہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ جہاں تک نارمل حالات میں لوگوں کے ساتھ مسلمان کے سلوک کا تعلق ہے وہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے جو قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان دوسری آیتوں میں مسلمانوں کو لوگوں کے درمیان مرحمت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے (البلد ۱۷) اسی طرح حکم ہے کہ لوگوں کے ساتھ عدل کا سلوک کرو (المائدہ ۴۲) اسی طرح فرمایا کہ لین دین میں ترازو کی طرح برابری کا معاملہ کرو (الرحمٰن ۹) وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک غیر مسلموں سے تعلق کا معاملہ ہے، قرآن میں اس کی بابت ایک بنیادی اصول مقرر کر دیا گیا ہے۔ جس سے انحراف مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ وہ یہ ہے: فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین (التوبہ ۸) یعنی جب تک وہ تمہارے ساتھ مستقیم رہیں تم بھی ان کے ساتھ مستقیم رہو اور اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ بین اقوامی معاملات میں یہی مساویانہ اصول ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے اور اسلامی شریعت میں بھی مساویانہ سلوک ہی کے اصول کو اختیار کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ قرآن بیک وقت ایک واحد کتاب کی صورت میں نہیں اترا، بلکہ وہ حالات کے اعتبار سے ۲۳ سال کے دوران اترا۔ ۲۳ سال کی اس مدت کو عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ۲۰ سال، دوسرے ۳ سال۔ ۲۳ سالہ مدت نزول میں ۲۰ سال گویا امن کے سال تھے اور تقریباً ۳ سال جنگی حالات کے سال۔ آپ نے جن ۲۴ آیتوں کا حوالہ دیا ہے وہ مذکورہ تقسیم کے مطابق ۳ سال حالات میں اتریں۔ قرآن کی دوسری آیتیں ۲۰ سال والی مدت میں اتریں اور وہ سب کی سب امن اور انصاف اور انسانیت جیسی مثبت تعلیمات پر مشتمل ہیں۔

۲۔مکتوب نگار نے دوسری بات جو لکھی ہے وہ حدیث پر مبنی ہے۔انہوں نے صحیح مسلم کے انگریزی ترجمے کے کئی صفحات بھیجے ہیں۔ان میں ایک حدیث وہ ہے جو صحیح مسلم (کتاب الایمان، کتاب الزکاۃ) میں آئی ہے۔اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: **من مات لا یشرک باللہ شینا دخل الجنۃ فقلت یا جبریل و اِن سرق واِن زلی .... قال نعم واِن شرب الخمر** (جو اس حال میں مرا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔میں نے جبریل سے کہا کہ اگر اس نے چوری کی، اگر چہ اس نے زنا کیا.....انہوں نے کہا کہ ہاں، اگر چہ اس نے شراب پیا)

اس حدیث کے بارے میں مکتوب نگار کی منفی رائے بھی صرف غلط فہمی پر مبنی ہے۔انہوں نے غالباً اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ مومن خواہ عادۃً چوری کرتا رہے، زنا کرتا رہے، شراب پیتا رہے، پھر بھی وہ جنت میں جائے گا۔حالانکہ حدیث کا یہ مطلب نہیں۔حدیث کا یہ مفہوم لینا اس وقت درست ہوتا جب کہ اس میں **یسرق** اور **یشرب** کے الفاظ ہوتے۔مگر ایسا نہیں ہے۔اس کے بجائے حدیث میں **واِن سرق واِن زنی شرب** کے الفاظ ہیں۔یعنی حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک شخص اگر استمراری طور پر سرقہ زنا اور شراب نوشی جیسے افعال میں مبتلا ہو تب بھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔بلکہ حدیث میں ماضی کا صیغہ ہے۔یعنی ماضی میں یا اتفاقاً اس سے یہ افعال ہو گئے تھے، پھر اس نے توبہ کر کے پاکیزہ زندگی اختیار کر لی تو وہ جنت میں جائے گا۔اس حدیث میں فعل اتفاقی کا ذکر ہے نہ کہ فعل جاری کا۔

اس حدیث میں عین وہی بات کہی گئی ہے جو صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔اصل یہ ہے کہ دور اول میں جن لوگوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا ان میں کئی لوگ ایسے تھے جن سے ماضی میں ایسے افعال سرزد ہوئے تھے جو شریعت اسلامی کے خلاف تھے۔ان کو اپنی ماضی کی اس غلطی کا شدید احساس ہوتا تھا۔چنانچہ ان میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسلام پچھلے

گناہوں کو ختم کر دیتا ہے (الاسلام یھدم ما کان قبلہ)۔

سوال

میں ۱۹۹۱ سے الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ الرسالہ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو ایک مخصوص خول سے نکال کر ایک وسیع النظر انسان بناتا ہے۔ الرسالہ پڑھنے کی وجہ سے میں اب ہر مکتبِ فکر کو پڑھنے لگا ہوں۔ میرے اندر جو ذہنی بزدلی تھی وہ الرسالہ کے پڑھنے سے دور ہوگئی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں مرزائیت کے متعلق غلام احمد پرویز کی کتاب پڑھ رہا تھا تو ایک دوست نے کہا کہ غلام احمد پرویز کو تو علماء نے کافر بتایا ہے پھر تم کیوں اس کی کتاب پڑھتے ہو۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (ایک قاری الرسالہ)

جواب

جہاں تک کتاب کا تعلق ہے، میرے نزدیک ہر کتاب کو پڑھنا چاہئے۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی عقل کو اتنا بیدار رکھے کہ وہ صحیح اور غلط میں فرق کر سکے۔ تکفیر کا موجودہ طریقہ بعد کے زمانہ کی ایک ایجاد ہے۔ وہ اسلام کے مطابق نہیں۔ مصر کے ایک عالم خالد العنبر ی کی کتاب چھپی ہے جس کا نام یہ ہے: ھز یمة الفکر التکفیری۔ اس کے مصنف نے موجودہ طرز تکفیر کو غیر صحیح بتایا ہے۔ اس کتاب کی رد میں سعودی عرب کے ایک عالم الشیخ صالح بن فوزان کا ایک مضمون ریاض کے عربی مجلّہ الدعوۃ (۴ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ۔ ۶ جولائی ۲۰۰۰) میں چھپا ہے۔ شیخ موصوف نے تکفیر کے طریقہ کو درست قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قرآن وحدیث سے دو حوالے نقل کئے ہیں۔ ایک منافقین مدینہ کے بارے میں قرآن کا ارشاد کہ: قد کفرتم بعد ایمانکم (التوبہ ۶۶) اسی طرح حدیث سے انہوں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: بین العبد وبین الکفر ترک الصلوۃ۔

شیخ مذکور کا یہ استدلال درست نہیں۔ انہوں نے دو چیزوں میں فرق نہیں کیا۔ اصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت یا حدیث عمومی اظہار ناراضگی کی مثال ہے نہ کہ شخصی تکفیر کی مثال۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ

قرآن میں مدینہ کے جن منافقین کے بارے میں ''کفر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ مگر اس آیت کے نزول کے باوجود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے افراد کا نام لے کر مشخص انداز میں کبھی ان کی تکفیر نہیں کی۔ اسی طرح حدیث میں ترک صلاۃ کے بارے میں ''کفر'' کا لفظ آیا ہے۔ مگر اس سے مراد مشخص تکفیر نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بہت سے مسلمان ایسے رہے ہیں اور آج بھی جو نماز کے تارک ہیں مگر علاء اسلام نے کبھی شخصاً شخصاً نام لے کر ان کی تکفیر نہیں کی۔

سوال

لکھنؤ سے ایک اردو ماہنامہ بانگِ درا کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ مولانا سلمان حسینی ندوی اس کے سرپرست ہیں۔ اس کیشمارہ مئی ۱۹۹۹ میں ''جامعہ سید احمد شہید کے شب و روز'' کے تحت ایک رپورٹ چھپی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ۳ مارچ ۱۹۹۹ کو شیخ دعیج ثمری (سکریٹری ایشین مسلمس) جامعہ میں آئے۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے ایک بلیغ خطبہ علم کی فضیلت اور علماء کی ذمہ داریوں سے متعلق دیا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ آج ایسے ذی علم اسلامی داعیوں کی اشد ضرورت ہے جو اسلام کو صحیح شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے اپنی زبان اور قلم کو بروئے کار لاسکیں اور باطل کے پروپیگنڈوں کا منھ توڑ جواب دے سکیں (صفحہ ۴۱) میرے علم کے مطابق آج کی مسلم دنیا میں آپ واحد نمایاں شخص ہیں جو علم وقلم کے ذریعہ اسلام کے دفاع کا یہ اہم کام کر رہے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ بانگِ درا کے شمارہ میں آپ کے خلاف پانچ صفحہ کا ایک مضمون شائع کیا گیا ہے جس کا عنوان یہ ہے ''بھلی بات اور مولانا وحید الدین خاں''۔ یہ پورا مضمون آپ کے خلاف ہے مگر میں سبّ وشتم اور الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ پورے مضمون میں کوئی ایک دلیل نہیں دی گئی ہے۔

مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مضمون میں آپ کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے یہ بے بنیاد بات لکھی گئی ہے کہ مولانا (وحید الدین) مسلمانوں کے مسائل، ان کی نفسیات اور ان کی شکایات کو صرف اپنے ایر کنڈیشنڈ آفس میں اور ڈبل ڈور روم میں بیٹھ کر سمجھ لیتے ہیں (صفحہ ۳۴)۔

میں بار بار دہلی میں آپ سے ملا ہوں اور دیر دیر تک آپ کے ساتھ آپ کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ آپ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کے کمرے میں ائر کنڈیشنر تو درکنار کولر بھی موجود نہیں جو آج معمولی گھروں تک میں پایا جاتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کے مخالفین آپ کے خلاف الزام تراشی کی زبان کیوں بولتے ہیں شاید اس لئے کہ انھیں یقین ہے کہ دلیل کے میدان میں ان کے پاس آپ کے لئے کچھ نہیں ہے۔

(ایک قاری الرسالہ لکھنؤ)

جواب

یہ باتیں جو مذکورہ جریدہ میں چھپی ہیں وہ کوئی نئی نہیں۔ اس قسم کی باتیں دوسرے اخبار و جرائد بھی چھاپتے رہے ہیں۔ عام طور پر میں ان بے بنیاد باتوں کے بارے میں خاموش رہتا ہوں۔ تاہم یہاں اصولی طور پر دو باتیں عرض کروں گا۔

۱۔ میں خدا کے فضل سے پچھلے پچاس سال سے تحریر و تقریر کے میدان میں دینی خدمت انجام دیتا رہا ہوں۔ میرا میدان کارعین وہی ہے جس کی ضرورت مذکورہ عرب شیخ نے جامعہ سید احمد شہید کے پروگرام میں بیان کی۔ اب وہ لوگ ایک سنگین جرم کے مرتکب ہیں جو میرے کئے پر چپ رہیں اور میرے نہ کئے کا خوب چرچا کریں۔ اس کے بجائے جس چیز کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اس کو خود سے میرے اوپر چسپاں کر کے اس کی بنیاد ہر مجھے غلط طور پر مطعون کریں۔ اس قسم کی منفی روش ایک اعتبار سے ایک شخص کی ناحق کردار کشی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ صدعن سبیل اللہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دعوت دین اور تعارفِ اسلام کی جو مہم چلا رہا ہے لوگ بے بنیاد طور پر بدظن ہو کر اس سے دور ہو جائیں۔

۲۔ کچھ لوگ میرے بارے میں بار بار اس طرح کی باتیں چھاپتے رہے ہیں کہ ائر کنڈیشنڈ کمرہ یا شاندار کوٹھی میں رہتا ہوں۔ جو لوگ ایسی باتیں لکھتے ہیں وہ مجھے قابلِ رحم نظر آتے ہیں۔ وہ صرف زندگی کی سطحی باتوں کو جانتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں کی انہیں خبر نہیں۔ ان حضرات کو یہ

معلوم نہیں کہ میں ائر کنڈیشنڈ کمرہ یا ائر کنڈیشنڈ کار کو بالکل بے حقیقت سمجھتا ہوں۔ میرے جینے کی سطح اس سے بالکل مختلف ہے جس سے یہ صاحبان واقف ہیں۔ اللہ کے فضل سے میرا یہ حال ہے کہ مجھے سادگی میں لذت ملتی ہے۔ آسائش کے جدید سامانوں کی طرف مجھے کوئی رغبت نہیں۔ حتیٰ کہ لگزری میرے لئے عذاب کے ہم معنی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے اس قسم کی دنیوی آسائشوں سے میں آخری حد تک بیزار ہوں۔ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ مئی۔ جون کے سورج کی گرمی میرے کمرے میں داخل ہو تو اس کے تجربہ سے مجھے ناز جہنم یاد آئے اور میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ پکار اٹھوں کہ اے میرے رب، مجھے جہنم کی شدید تر گرمی سے بچا۔ کولر اور اے سی کی مصنوعی ٹھنڈک سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میرے کمرہ کی کھلی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا میرے کمرے میں داخل ہو جو مجھے لمس ربانی کے تجربہ سے آشنا کرے۔ میں اپنی تر نہائیوں میں اکثر اس قولِ رسول کو دہراتا ہوں: **اللھم لا عیش الآخرۃ**۔ میرا عمل خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کی اس نصیحت پر ہے جو انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی: **اخشوشنوا**۔ (لسان العرب ۱۳/۱۴۰)

سوال

سورہ الاعراف میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: **واذتادن ربک لیبعثن علیھم اِلی یوم القیامۃ من یومھم سوء العذاب اِن عبک لسریع العقاب وانہ لغفور رحیم** (۱۶۷)۔ اس آیت کی تشریح کیا ہے۔ براہ کرم جواب تحریر فرمائیں۔ (سید حلیم، ینبع، سعودی عرب)

جواب

اس آیت کی مفصل تشریح تذکیر القرآن (جلد اول، ۴۱۹۔۴۱۸) میں ملاحظہ فرمائیں۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت سے مراد استمراری عذاب نہیں ہے۔ خود قرآن کے مطابق، ان پر حسنات (الاعراف ۱۶۸) کے وقفے آتے رہیں گے اور یہود کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ وہ یہود کے لئے تہدید ہے اور مسلمانوں کے لئے تنبیہ۔ اللہ کا یہ

قانون صرف یہود کے لئے نہیں تھا۔ وہ بعد کے اس گروہ کے لئے بھی ہے جس کو یہود کی معزولی کے بعد خدا کی گواہی کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنے کو اس حال میں پائیں کہ وہ غیر مسلم قوموں کی چیرہ دستی کا شکار ہو رہے ہوں اور ان کی جمعیت چھوٹے چھوٹے جغرافیوں میں بٹ کر متفرق ہوگئی ہو تو ان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احتساب الٰہی کی اسی زد میں آگئے ہیں جس میں یہود آئے۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ شہد ایک پاک غذا ہے اور نہایت مفید ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ شہد تو ایک مکھی کا فضلہ ہے۔ دنیا میں لاکھوں قسم کے جانور ہیں مگر کسی بھی جانور کا فضلہ پاک نہیں۔ پھر شہد کی مکھی کا فضلہ کیونکر پاک ہوسکتا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں (ایک قاری الرسالہ)

جواب

یہ صحیح ہے کہ عام مکھیوں کا یا کسی دوسرے جانور کا فضلہ پاک نہیں۔ مگر شہد کی مکھی جو شہد تیار کرتی ہے وہ اس کا فضلہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شہد مکمل طور پر ایک پاک غذا ہے جو انتہائی پاک طریقہ سے مخصوص فطری نظام کے تحت تیار کی جاتی ہے۔

شہد کی مکھی ایک استثنائی مخلوق ہے۔ اسکا طریقہ یہ ہے کہ وہ پھولوں سے قدرتی مٹھاس حاصل کرتی ہے۔ اسکو لے جا کر وہ اپنے چھتہ کے اسٹور میں جمع کرتی ہے۔ یہ کام اول سے آخر تک نہایت پاکیزہ طریقہ پر ہوتا ہے۔ مطالعہ بتاتا ہیکہ دنیا میں تقریباً ۲۰ ہزار قسم کی مکھیاں ہیں اور وہ کروڑوں قسم کے جانور ہیں۔ مگر شہد کی مکھی کے اندر انتہائی استثنائی صفت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اسکے جسم میں دہرا معدہ (double stomach) کا نظام قائم ہے۔

اسکی خوراک کیلئے ایک علیحدہ معدہ ہے جسکے اندر وہ اپنی خوراک داخل کرتی ہے اور اسکو ہضم کر کے اپنے جسم کی غذائی ضرورت پوری کرتی ہے۔ جہاں تک پھولوں سے حاصل کئے ہوئے رس کا تعلق ہے جسکو شہد کہا جاتا ہے اسکو وہ علیحدہ طور پر ایک خصوصی معدہ میں جمع کرتی ہے:

Besides abdomen they also have a special stomach called the honey stomach in which they carry nectar.

(The World Book Encyclopaedia, Vol-2, p. 184)

شہد کی مکھی کے بارے میں اس تحقیق سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شہد کسی مکھی کا فضلہ نہیں ہے۔ وہ پھولوں میں پیدا ہونے والا میٹھا اور پاکیزہ رَس ہے جس کو فطری انتظام کے تحت پھول سے نکال کر شہد کی مکھی اپنے مخصوص اسٹور روم میں جمع کرتی ہے اور پھر اسکو لے جا کر چھتہ کے پاکیزہ خانوں میں ذخیرہ کر دیتی ہے تا کہ وہ انسان کے کام آسکے۔

دوسری اہم بات جو اس سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہ کہ شہد کی مکھی خدا کے وجود اور خدا کی قدرت کا ایک عظیم ثبوت ہے۔ جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے، شہد کی مکھی کے اندر خصوصی معدہ ہونے کا نظام ایک استثنائی واقعہ ہے۔ زمین پر کروڑوں قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں مگر خصوصی معدہ کا یہ منفرد نظام صرف شہد کی مکھی کے اندر موجود ہے۔ وہ انسان کی ضرورت کے لئے اس کے اندر استثنائی طور پر رکھا گیا ہے۔ یہ استثنائی (exception) ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا کی تخلیق میں ذہن منصوبہ بندی پائی جاتی ہے اور ذہن منصوبہ بندی (intelligent planning) ایک خالق کے وجود کا یقینی ثبوت ہے۔

یہ استثناء ایک بامعنی مداخلت کو بتاتا ہے اور جب کسی نظام میں اسکے عموم کے خلاف بامعنی مداخلت کا ایک واقعہ ثابت ہو جائے تو اسکے بعد صاحب مداخلت کا وجود اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔

سوال

دنیا میں ہمیشہ جادو پایا جاتا ہے۔ فرعون مصر کے جادوگروں سے لے کر اب تک جادوگری کا یہ فن موجود ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ زور پر چیزوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فرعون کے زمانہ میں مصر کے جادوگروں نے رسّیوں اور لاٹھیوں کو بدل کر انہیں سانپ بنا دیا تھا (طٰہٰ ٦٦) کیا یہ کسی انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ خدا کی تخلیق کو بدل دے اور چیزوں کو کچھ سے کچھ بنا دے۔

(ایک قاری الرسالہ، ناندیڑ)

جواب

جادو کے بارے میں اس قسم کا خیال درست نہیں۔ جادوگر جو کام کرتا ہے وہ نظر بندی ہے نہ کہ کسی چیز کو بدل کر اس کو کچھ سے کچھ کر دینا۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو آگرہ میں ۸ نومبر ۲۰۰۰ کو پیش آیا۔ یہ واقعہ اسی زمانہ کے اخباروں میں چھپا تھا۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ آگرہ کے تاج محل کو دیکھنے کے لئے بہت لوگ اکٹھا تھے۔ اس وقت کلکتہ کا مشہور جادوگر پی۔ سی سرکار (P.C. Sorcar) آیا۔ اس نے ۲ منٹ کے لئے تاج محل کو ''غیر موجود'' کر دیا۔ دیکھنے والوں نے اچانک دیکھا کہ تاج محل دن کی روشنی میں ان کی نظروں سے غائب ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے بعد تاج محل دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا دکھائی دینے لگا۔ اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے خود مذکورہ جادوگر نے بتایا کہ میں نے تاج محل کو غیر موجود نہیں کیا تھا بلکہ صرف ایک ٹرِک (trick) کے ذریعہ ایسی تدبیر کی تھی کہ تاج محل وقتی طور پر لوگوں کو دکھائی نہ دے۔ اس نے کہا کہ اس قسم کے جادو کی حقیقت یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر تصرف کر کے انسان کی آنکھ اور چیز (object) کے درمیان روشنی کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ چیز موجود ہوتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتی یا کسی اور صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ حیدرآباد کے انگریزی اخبار دکن ہیرالڈ (Deccan Herald) کے مطابق مذکورہ جادوگر نے اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

The Taj Mahal did not disappear, it was only out of sight. An object is said to have vanished when the light rays coming from that object cannot enter the eyes. If the rays coming from the object are bent, the image can be distorted or varished.

(The Deccan Herald, Hyderabad, December 24, 2000)

بنگال کے مذکورہ جادوگر مسٹر سرکار نے مزید کہا کہ سائیں بابا جیسے لوگ جو چمتکار دکھاتے ہیں وہ سب میں بھی دکھا سکتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ سائیں بابا جیسے لوگ اپنے آپ کو گاڈ (God) کہتے ہیں مگر میں اپنے آپ کو پریٹنڈر (Pretender) کہتا ہوں۔

سوال

میرا کام ایسا ہے کہ مجھ کو زیادہ تر ہندوؤں کے درمیان رہنا پڑتا ہے، ہندو لوگوں سے اکثر باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے پایا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے دو سب سے بڑی شکایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلم حکمرانوں، مثلاً اورنگ زیب نے ہندوؤں کے اوپر ظلم کیا، دوسری شکایت یہ ہے کہ مسلم لیڈروں نے ملک کا بٹوارہ کرایا، میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ تو پہلے کی باتیں ہیں۔ آج کا ہندستانی مسلمان تو ہندوؤں سے پوری طرح میل ملاپ کر کے رہنا چاہتا ہے مگر وہ لوگ میرے اس جواب پر مطمئن نہیں ہوتے، ایسی حالت میں رہنمائی فرمائیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ (ایک قاری الرسالہ)

جواب

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ ہم تو مسلمانوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اورنگ زیب اور مسٹر جناح کے زمانے میں تو ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہمارے اوپر ان کے کئے کی ذمہ داری کیوں۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی عمل ایک مشترک عمل ہوتا ہے۔ قوم کے کچھ لوگ ایک عمل کریں اور قوم کے دوسرے افراد خاموش رہیں تو پوری قوم اس عمل میں شریک سمجھی جائے گی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ افراد ہیں جو اعلان کے ساتھ اس عمل سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) کریں، یعنی اس سے اپنی بے تعلقی اور علیحدگی کا اعلان کر دیں۔

ہندستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان معتدل تعلقات صرف اسوقت قائم ہو سکتے ہیں جبکہ وہ اعلان کے ساتھ مغل حکمرانوں یا تقسیم ہند کے لیڈروں سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) کریں، یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم تو اسوقت موجود ہی نہ تھے۔ قرآن میں رسول اللہ کے ہم عصر یہودیوں کو پچھلے نبیوں کے قتل کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے (النساء ۱۵۵)۔ حالانکہ یہ لوگ یہودیوں کی بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے مگر چونکہ وہ اپنے پچھلے اکابر کے فعل سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) نہیں کرتے تھے اس لئے بعد کے یہودیوں کو بھی پچھلے یہودیوں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان اپنے سابق حکمرانوں یا اپنے سابق لیڈروں کوڈس اون (disown) کیوں نہیں کرتے۔ اس پر غور کیجئے تو ایک بے حد سنگین حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ مسلمان اسلام کی فکری عظمت پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ بعد کو بننے والی مسلم تاریخ کی عظمت پر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ کی عظمت کے بجائے اپنے سیاسی اکابر کی عظمت میں جی رہے ہیں۔ ایسی حالت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے سیاسی اکابر کو ڈس اون (disown) کیا تو وہ اچانک بے زمین ہو جائیں گے اس کے بعد عظمت کی کوئی اور زمین نہ ہوگی جس کے اندر وہ پُرفخر طور پر کھڑے ہوسکیں۔

مزید یہ کہ اللہ کی دریافت آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتی ہے، جب کہ پُرعظمت تاریخ سے اس کو فخر کی غذا ملتی ہے۔ موجودہ مسلمان اپنی زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر تواضع میں کوئی لذت نہیں پاتے، اس کے برعکس فخر اور ناز میں جینا ان کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے حالانکہ مومن وہ ہے جو تواضع کی نفسیات میں جئے، نہ کہ فخر و ناز کی نفسیات میں۔

سوال

ماہنامہ الرسالہ کا شمارہ فروری ۲۰۰۱ دیکھا۔ میرے خیال سے یہ شمارہ ایک قسم کا نمبر ہے۔ میرے نزدیک اس کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مختلف ملکوں میں جو سیاسی اور انقلابی تحریکیں اٹھائی گئیں ان کو آپ غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ مگر اس نقطۂ نظر کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے مطابق ہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: **من رای منکم منکر أفليغيرهبيده فإن لم يستطع فبلمانه فإن لم يستطو فبقلبه و ذلک اضعف الايمان** (مشکوۃ المصابیح ۳/۱۴۲۱) اس فرمانِ رسول کے مطابق تغیّر منکر مسلمانوں کا لازمی فریضہ ہے۔ یہ تحریکیں اسی فریضہ کو ادا کرنے کی کوشش ہیں۔ تغیّر منکر کے فریضہ ادا کرنے کی دوسری اور کوشش کیا ہوسکتی ہے (ایک قاری الرسالہ، حیدرآباد)

جواب

آپ نے مذکورہ تحریکوں کی حمایت میں جس دلیل کا ذکر کیا ہے وہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حضرات قرآن وحدیث کو اس طرح نہیں لیتے کہ خالی الذہن ہو کر اسلامی حکم کو معلوم کریں۔ بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اس کو کسی نہ کسی طرح آیتوں اور حدیثوں کے حوالے سے صحیح ثابت کر سکیں۔

اب مذکورہ حدیث رسول پر غور کیجئے۔ حدیث کے اصل الفاظ کے مطابق، مسلمان کی ذمہ داری استطاعت کے بقدر ذاتی پیروی ہے، نہ کہ استطاعت کے دائرہ کو بڑھانے کے لئے دوسروں سے لڑائی چھیڑنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بروقت جو استطاعت آپ کو حاصل ہے، اس استطاعت کے اعتبار سے آپ کو اپنی ممکن ذمہ داری ادا کرنا چاہیئے۔ اپنے ممکن دائرہ کو چھوڑ کر غیر ممکن دائرہ پر قابض ہونے کے لئے ہنگامہ آرائی کرنا اس حکم شریعت کی خلاف ورزی ہے نہ کہ اس کی پیروی۔

سوال

پہلے میں ایک گروہ سے وابستہ ہوا اور ان لوگوں کے ساتھ رہ کر میں نے چند مصنفوں کی کتابیں پڑھیں مثلاً سید قطب، سید احمد شہید وغیرہ۔ ان میں زیادہ تر جہاد بالسیف کا ذکر تھا۔ آخر کار میں بارہویں کا امتحان دئے بغیر مجاہدین کے ساتھ چل پڑا اور میں تقریباً چار سال ان سے وابستہ رہا۔ پھر میں نے گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا۔ گھر والوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ ہمارے گھر کی مالی اور تعلیمی سرگرمیوں پر برا اثر پڑا۔ ۱۹۹۹ میں میں گرفتار ہوا اور اللہ پاک کی مرضی سے میری جان بچ گئی۔ اس کے بعد مجھے پولس نے P.S.A. (public safety act) کے مطابق نظر بند رکھا۔ جیل خانے میں میری ملاقات ایک معروف شخصیت سے ہوئی اس نے مجھے ایک کتاب (اسلام ایک تعارف) دی وہ آپ کی ہی لکھی ہوئی تھی۔ پھر میں نے آپ کی پچاس ساٹھ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد میرا ذہن بدل گیا، میں نے پھر جیل میں examination form بھر دیا اور باقاعدہ طریقے سے میرا T.D.C. کا امتحان conduct ہوا۔ اب میں دسمبر ۲۰۰۰ یعنی ۹ رمضان المبارک کو رہا

(release) ہوا۔ اب میری خواہش ہے کہ اسلام پر زندگی کو چلاؤں اور پڑھائی بھی کروں لیکن گھر کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں اور اس وقت میری عمر ۲۱ سال کی ہے یہ میرے کمانے کا بھی ٹائم ہے۔ مولانا صاحب آپ سے گذارش ہے کہ آپ آگے میری رہنمائی فرمایئے۔ (ایک مسلم نوجوان، کشمیر)

جواب

یہ صرف ایک مسلم نوجوان کی کہانی نہیں، بلکہ وہ موجودہ زمانہ کے لاکھوں مسلمانوں کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانے میں جہاد کے نام پر مختلف ملکوں میں جو انتہا پسندانہ تحریکیں چلائی گئیں انہوں نے بے شمار مسلم خاندانوں کو تباہ کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں نہ اسلام کو کچھ ملا اور نہ مسلمانوں کو۔ اس قسم کی تحریکیں بلاشبہہ اسلامی تحریکیں نہیں اور نہ اس قسم کی عسکری سرگرمیاں اسلامی جہاد ہیں۔ یہ سب ایک نادانی کا ردعمل تھا جو اسلام کے نام پر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اس کے نتیجہ کے لحاظ سے دیکھنا چاہیئے۔ جو تحریک لوگوں میں نفرت اور تشدد کو بھڑکائے وہ کبھی اسلامی تحریک نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح جو عسکری سرگرمی لوگوں کی تباہی میں اضافہ کرے وہ کبھی اسلامی جہاد نہیں ہوسکتا۔ جو ناپختہ نوجوان اس قسم کی تحریکوں کا شکار ہوتے ہیں وہ شاید اپنی کم فہمی کی بنا پر قابلِ معافی قرار پائیں مگر جو لوگ ان تحریکوں کی لیڈری کرتے ہیں وہ بلا شبہہ ایک سنگین جرم کر رہے ہیں جو کسی طرح قابل معافی نہیں۔

سوال

قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر جنت میں داخل کیا۔ پھر جنت سے نکال دیا اور زمین پر چھوڑ دیا اور اسکے بعد دنیا بننی شروع ہوئی۔ چونکہ ساری کائنات کے لوگ اسی جوڑے (حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ) کے بعد دنیا میں آئے اور پہلا جوڑا یہی تھا۔ میرا ذہن یہ سوال کرتا ہے کہ اگر ہم آج کی دنیا میں دیکھیں تو مجھے اپنی زبان (language) اپنے ماں باپ سے ہی ملی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اگر ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد یعنی آدمؑ کی اولاد ہیں تو ہماری زبان ایک کیوں نہیں ہے؟۔ یہ اتنی زبانیں کہاں سے پیدا ہوئیں؟۔ ساری دنیا میں ایک زبان ہونی چاہیئے تھی جس کو سب سمجھ سکتے اور بول بھی سکتے۔ یعنی حضرت آدم کی زبان۔ (نذیر احمد صوفی، سری نگر)

جواب

یہ ایک کنفیوزن کی بات ہے نہ کہ حقیقی معنی میں کوئی سوال۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ضروری سوال اور غیر ضروری سوال میں فرق کرے ورنہ وہ ساری عمر ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اندر صحت مند فکر کا ارتقاء نہ ہو سکے گا۔

جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے اس کو عام تجربہ کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک خاندان میں چار لڑکے ہیں۔ تلاش معاش کے تحت وہ چار ملکوں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں بس جاتے ہیں۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ چاروں کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گی۔ تقریباً اسی طرح کا کچھ معاملہ حضرت آدمؑ کی اولاد کے ساتھ پیش آیا۔ مہاجرت کے ذریعہ لوگوں کی زبانیں بدلتی رہیں، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بہت سی زبانیں وجود میں آگئیں۔ اس موضوع پر آپ کو وہ کتابیں پڑھنی چاہئیں جو زبانوں کی تاریخ پر لکھی گئی ہیں۔

سوال

آپ الرسالہ میں جہاں قرآن وحدیث کا حوالہ عربی میں پیش کرتے ہیں تو اس کا ترجمہ بھی کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا نہ ہونے کی وجہ سے عربی نہ جاننے والوں کو تشنگی رہ جاتی ہے۔ جیسے ماہ اکتوبر ۲۰۰۰ کے رسالہ کے صفحہ ۲۶ میں سطر ۱۵-۱۶ دیکھیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ براہِ کرم جہاں بھی قرآن وحدیث کا حوالہ عربی میں دیں تو عربی کا ترجمہ اردو میں ضرور لکھیں۔ (امان اللہ، سیوان)

جواب

یہ شکایت درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ الرسالہ محض عام قسم کا ایک ماہنامہ نہیں، وہ مکمل طور پر ایک مشن ہے اسکا مقصد پڑھنے والے کو صاحب مشن بنانا ہے نہ کہ اسکو وقتی قسم کی ایک ذہنی تفریح فراہم کرنا۔ آپ کو چاہیئے کہ الرسالہ کو آپ اپنے لئے رابطہ کا ذریعہ بنائیں۔ الرسالہ کی باتوں پر لوگوں سے مذاکرہ کریں۔ الرسالہ کے پیغام کو دوسروں تک پہچانے کی کوشش کریں۔ اسطرح یہ ہونا چاہیئے کہ اگر قاری کو اسکا کوئی عربی لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آئے تو اسکو سمجھنے کیلئے وہ اپنے قریبی عالم سے رابطہ قائم

کرے اور اگر کسی قاری کو انگریزی کا کوئی لفظ یا جملہ مشکل معلوم ہو تو وہ اس کو سمجھنے کیلئے اپنے قریب کے کسی انگریزی داں سے ملے۔ الرسالہ کا حقیقی قاری وہی ہے جس کی زندگی میں الرسالہ اسطرح شامل ہو جائے کہ وہ اسکے لئے لوگوں سے ربط کا ذریعہ بن جائے، وہ اس کیلئے لوگوں سے تعلقات کا مرکز و محور بن گیا ہو۔

یہ ایک ایسا کام ہے جو الرسالہ کے ہر قاری کو کرنا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کے پاس وقت ہے اور اسباب موجود ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے علم کو بڑھائیں۔ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ جو چیز ان کو آج معلوم نہیں ہے، کل کے دن وہ انہیں معلوم ہو جائے۔

سوال

میں بہت مجبور ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی اور جہاں میری ممّی شادی کروا رہی ہیں وہاں تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہتی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی لڑکا صرف دنیا کو دکھانے کیلئے مجھ سے شادی کر لے۔ مجھے صرف زندگی گذارنی ہے۔ زندگی جینے کی ذرہ برابر بھی خواہش نہیں ہے لیکن سماج میں اکیلے ایک لڑکی زندگی نہیں گزار سکتی اور کسی سے یہ بات کہہ نہیں سکتی اور کوئی بھی ایسا انسان نہیں ہے جس سے میں مشورہ لے سکوں۔ **please** آپ میری مدد کریں۔ میں اپنے جواب کا بے صبری سے انتظار کروں گی۔ (ایک مسلم خاتون)

جواب

شادی کے سلسلہ میں اکثر لڑکے یا لڑکیاں اپنی فرضی آرزوؤں کے تحت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا میں ان کیلئے کوئی معیاری جوڑا موجود ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی بیوی معیاری بیوی ہے اور نہ ہی کوئی شوہر معیاری شوہر۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر پسند والی شادیاں درمیان ہی میں ٹوٹ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی معیاری جوڑے کے حصول کا نام نہیں ہے بلکہ وہ غیر معیاری جوڑے کے ساتھ نباہ کرنے کا نام ہے۔

عورت اور مرد دونوں کیلئے زندگی فطرت کا ایک قیمتی تحفہ ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد کو چاہیئے کہ وہ

اس تحفہ کو خوشی کے ساتھ قبول کرے۔ وہ جینے کی طرح جئے اور جب اسکی موت آئے تو وہ اس احساس کے ساتھ مرے کہ اس نے زندگی کا فریضہ ادا کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ غیر مطلوب جوڑے کے ساتھ زندگی گزارنا یا غیر مطلوب افراد کے ساتھ کام کرنا کوئی برائی نہیں۔ اس کے اندر ایک بے حد مثبت پہلو چھپا ہوا ہے، وہ یہ کہ اسی کے دوران انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی ہوتی ہے۔ ذہنی اور روحانی ترقی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ انسان ناموافق صورتحال پر راضی ہو جائے، وہ فرق اور اختلاف کے باوجود مل جل کر رہنے کا طریقہ سیکھ لے۔ اپنی پسند کی دنیا تلاش کرنے کا نام عقل مندی نہیں، عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پسند کے خلاف جینے کا راز دریافت کر لے۔

سوال

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء نہیں تسلیم کرتے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟۔ براہ کرم واضح فرمائیں۔ (سید احسن الدین، مراد آباد)

جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انسانوں، بشمول انبیاء علیہم السلام پر، افضل و اعظم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار سرے سے ممکن ہی نہیں۔ صاحب ایمان تو درکنار، غیر مسلم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز مورخ ٹامس کارلائل (وفات ۱۸۸۱) نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں کا ہیرو بتایا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے ایک اسکالر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے آپ کو تمام انسانوں میں سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے، وغیرہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل ہونا بجائے خود ایک مسلم واقعہ ہے۔ یہاں اصل سوال خود اس واقعہ کا نہیں بلکہ اس کی تعبیر کا ہے۔ یعنی اس حقیقت کی منصوص تعبیر کیا ہے اور اس کے اظہار کا منصوص طریقہ کیا ہے؟۔ مثال کے طور پر ایک تسلیم شدہ واقعہ ہے کہ ہر مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی گہرا قلبی تعلق ہونا چاہیئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، اس قلبی کیفیت کی منصوص تعبیر محبت رسول ہے، عشق رسول اس کی منصوص تعبیر نہیں۔

تعبیر کا یہی فرق مذکورہ مسئلہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''افضل الانبیاء'' کی تعبیر قرآن یا حدیث میں اختیار نہیں کی گئی۔ مثلاً قرآن میں 'محمد رسول اللہ وخاتم النبیین' تو ہے مگر قرآن میں کہیں بھی 'محمد افضل الانبیاء' جیسی کوئی آیت نہیں۔ اسی طرح حدیث میں 'انا الماحی' تو ہے مگر حدیث میں کہیں بھی 'انا افضل الانبیاء' جیسا کوئی کلمہ نہیں۔

تعبیر کا یہ فرق ایک بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ یہ حکمت کیا ہے، وہ ایک حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ کے ایک مسلمان اور مدینہ کے ایک یہودی کے درمیان تکرار ہوئی۔ یہودی نے قسم کھا کر کہا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ یہ سن کر مسلمان نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے چہرہ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ اے خبیث، کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر بھی؟۔ اس کے بعد یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور مسلمان کے خلاف شکایت کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تفضلونی علی الانبیاء (تفسیر ابن کثیر ۱/۳۰۴) یعنی مجھ کو دوسرے نبیوں پر فضیلت نہ دو۔ اس مفہوم کی اور بھی کئی روایتیں ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تفضلوا بین الانبیاء (صفحہ ۳۰۴) یعنی نبیوں کے درمیان ایک دوسرے کو افضل نہ بتاؤ۔

مذکورہ روایت بتاتی ہے کہ افضل الانبیاء کی تعبیر شریعت میں کیوں اختیار نہیں کی گئی۔ مسلمان اور یہودی کے مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل الانبیاء کی تعبیر، بطور واقعہ درست ہونے کے باوجود لوگوں کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک اپنے فخر کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ضروری قسم کے نزاعات ابھرتے ہیں۔

ایک گروہ دوسرے گروہ پر اپنی برتری ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے، جب کہ زیادہ صحیح اور مفید بات یہ ہے کہ خدا کا اصل دین لوگوں کے درمیان زیر بحث آئے۔ داعی اور مدعو کے درمیان دعوت کے موضوع پر ڈائلاگ ہو نہ کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے میں مصروف ہو جائیں۔

اس معاملہ میں قرآن وحدیث سے جو منصوص تعبیر ملتی ہے اس کا فائدہ یہی ہے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) کہا گیا ہے۔ یہ تعبیر اہل ایمان کے اندر

ذمہ داری کا جذبہ ابھارتی ہے۔اس سے یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ پیغمبر کے بعد اب پیغمبر کے ماننے والوں کو یہ کام کرنا ہے کہ آپ کے لائے ہوئے دین کی ہر زمانہ اور ہر نسل میں اشاعت کرتے رہیں۔ وہ ختم نبوت کے بعد پیغام نبوت کا تسلسل دنیا میں جاری رکھیں۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ ختم نبوت کے بعد آپ کی امت مسئولیت کے اعتبار سے مقام نبوت پر ہے۔پہلی تعبیر اگر فخر کا احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری تعبیر ذمہ داری کا احساس ابھارتی ہے۔

اسی طرح حدیث کی یہ تعبیر کہ ''انا الماحی الذی یمحو بی اللہ الکفر (البخاری، کتاب المناقب) یعنی میں مٹانے والا ہوں، اللہ میرے ذریعہ سے کفر کو مٹائے گا۔اس تعبیر سے دوبارہ ذمہ داری کا گہرا احساس پیدا ہوتا ہے۔اس میں اہل ایمان کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ہر دور میں جو باطل نظریہ ابھرے، ہر دور میں دین حق کے خلاف جو شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں ان کے مقابلہ میں وہ بھر پور طور پر کھڑے ہوں اور ہر فکری اور نظریاتی محاذ پر اٹھنے والے طوفانوں کو پیچھے دھکیل دیں۔ یہ وہی فکری جہاد ہے جس کو قرآن میں جہاد کبیر کہا گیا ہے (الفرقان ۵۲)

تعبیر کی اہمیت نفسیاتی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔مثلاً پیغمبر کے ساتھ قلبی تعلق کے بارے میں عشق رسول کی غیر منصوص تعبیر خوش عقیدگی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔اس کے مقابلے میں محبت رسول کی منصوص تعبیر اطاعت رسول کا جذبہ ابھارتی ہے۔اسی طرح افضل الانبیاء کی غیر منصوص تعبیر فخر کا مزاج پیدا کرتی ہے۔اس کے مقابلے میں قرآن وحدیث کی مذکورہ منصوص تعبیر دعوت اور عمل کا جذبہ ابھارتی ہے۔

سوال

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے اجودھیا کی بابری مسجد کے مسئلہ کا یہ حل پیش کیا کہ بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔کیا کوئی مسجد کسی کے حوالے کی جاسکتی ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔(سید اکرام الدین، حیدرآباد)

جواب

مسجد ابدی طور پر مسجد ہے۔ مسجد حکماً اللہ کی ملکیت ہے نہ کہ مسلمانوں کی ملکیت۔ اس لئے مسجد کو کسی بھی مسلم یا غیر مسلم کے حوالے نہیں کیا جاسکتا، کسی بھی شخص کو اس قسم کا حق حاصل نہیں۔ میرے بارے میں جو لوگ مذکورہ قسم کی بات کہتے ہیں، وہ میرے اوپر ایک بے بنیاد الزام لگاتے ہیں۔ کیوں کہ میں نے نہ کبھی ایسا کہا اور نہ کبھی ایسا لکھا، میری کسی بھی تحریر سے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقلِ عام ''کامن سنس'' ہی کافی ہے۔ اس معاملہ میں کامن سنس کو استعمال کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتا۔ جب مسجد اللہ کی ملکیت ہے، وہ کسی انسان کی ملکیت نہیں، ایسی حالت میں اگر میں ایسا کہوں کہ مسلمان بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں تو یہ میرے لئے خود اپنی حیثیت عرفی (reputation) کی نفی کے ہم معنی ہوگا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں مسجد کے معاملہ میں شرعی حکم کو نہیں جانتا اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی حیثیت عرفی کی نفی کا تحمل نہیں کرسکتا، پھر میں کیوں کر ایسا کروں گا۔

میں اللہ کے فضل و توفیق سے تقریباً پچاس سال سے قرآن و حدیث کی خدمت کر رہا ہوں۔ میرے اس کام کی اہمیت اسی لئے ہے کہ لوگ مجھ کو عالم دین سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں میں خود اپنے ساتھ دشمنی کروں گا اگر میں مسجد کے بارے میں مذکورہ قسم کا بیان دوں۔ کیوں کہ اس کے بعد لوگوں کی نظر میں میرا عالمِ دین ہونا مشتبہ ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ میرا پورا دینی مشن بھی۔ اتنے نازک معاملہ میں میں اتنی بڑی نادانی کیسے کرسکتا ہوں۔

بابری مسجد کے معاملہ میں میری رائے اول دن سے اور اب تک ایک ہی رہی ہے۔ اس کی تفصیل الرسالہ کے شماروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ الرسالہ کے یہ مضامین یکجائی طور پر ایک کتاب میں شائع کئے جا چکے ہیں جس کا نام قیادت نامہ ہے۔ تفصیل کے طالب اس کتاب کو دیکھ سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ۱۹۹۲ کے حادثہ سے پہلے اور حادثہ کے بعد ہر مرحلہ میں میں ایک ہی بات کہتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ جمہوریت کے ماحول میں جب بھی کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو ہمیشہ پرامن دائرہ

میں حل کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ۱۹۹۲ء سے پہلے کچھ خود ساختہ مسلم لیڈر مسجد کی تحریک کو سڑک پر لے آئے۔ انہوں نے ایک مقامی مسئلہ کو آل انڈیا مسئلہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دھمکی کی زبان استعمال کرنا شروع کیا، مثلاً وہ کہتے تھے کہ بابری مسجد کو چھو کر تو دیکھو۔ اسی طرح انہوں نے اعلان کیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمان مارچ کر کے اجودھیا میں داخل ہو جائیں گے اور یہ کہ اگر بابری مسجد ٹوٹی تو سارا ملک ٹوٹ جائے گا، وغیرہ۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے کہا تھا کہ جلسہ جلوس کی سیاست گرمی زیادہ پیدا کرتی ہے اور روشنی کم۔ یہی میرا کہنا تھا۔ اس معاملہ میں بقیہ علماء اور رہنماؤں سے میرا اختلاف صرف طریقہ کار میں تھا نہ کہ نفس مسئلہ میں۔ جہاں تک مسجد کی شرعی نوعیت کا تعلق ہے اس بارے میں میرا نقطۂ نظر عین وہی تھا جو دوسرے حضرات کا رہا ہے۔ البتہ میرا کہنا تھا کہ اس معاملہ کو عدالت یا پُر امن گفت وشنید کے دائرہ تک محدود رکھنا چاہیئے۔

حالات اب دو اور دو چار کی طرح ثابت کر چکے ہیں کہ جس نقطۂ نظر کی حمایت میں نے کی تھی وہی اس معاملہ میں صحیح ترین نقطۂ نظر تھا۔ حتی کہ اب تمام اصاغر و اکابر عملاً اسی روش کو اختیار کر چکے ہیں جس کی رہنمائی الرسالہ میں دی گئی تھی۔

لیک بعد از خرابی بسیار

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ اگر راقم الحروف کی رائے پر عمومی طور پر عمل کیا جاتا تو یہ یقینی ہے کہ بابری مسجد کا تاریخی ڈھانچہ اپنی جگہ قائم رہتا، وہ کبھی توڑا نہ جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا انتہائی واقعہ ہمیشہ اشتعال انگیز فضا میں کیا جاتا ہے۔ معتدل فضا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کسی مسجد پر حملہ کرے اور وہ اس کو توڑ ڈالے۔ اس نقطۂ نظر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد جب حالات اعتدال پر آ گئے اور جلسہ جلوس کی سیاست ختم ہو گئی تو اس کے بعد کوئی اور مسجد ڈھائی نہیں گئی۔ حالانکہ جیسا کہ معلوم ہے بابری مسجد کو توڑنے والے لوگ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے یہ اعلان کر رہے تھے کہ ملک میں تین سو ایسی مسجدیں ہیں جن کو توڑ کر ہمیں دوبارہ مندر بنانا ہے۔ یہ ساری سیاست اس

طرح ختم ہوگئی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

سوال

آپ کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار آپ مسلمانوں کو قرار دیتے ہیں کہ وہی اس کی ابتدا کرتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کے لوگوں کو آپ اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ کیا یہ صحیح بات ہے؟، زیادہ تر مسلمانوں کی غلطیوں کی نشاندہی آپ کس لئے کرتے ہیں وضاحت فرمائیں۔ (سید نسیم الدین مجاہد، حیدرآباد)

جواب

فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں میرا نقطۂ نظر کیا ہے اس کو سمجھنے کے لئے میری کتاب ''حل یہاں ہے'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر اس کے ''آغاز کلام'' کو۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۵ میں شائع ہوئی۔ یہ میرے اوپر بے بنیاد الزام ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان فساد کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ فساد کا ابتدائی ذمہ دار کون ہے۔ دوسرے یہ کہ فساد کے مسئلہ کو حل کیسے کیا جائے۔ اس موضوع پر جو کچھ میں نے لکھا اس کا تعلق اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو سے ہے وہ یہ کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کون شروع کرتا ہے۔ دوسرے لکھنے اور بولنے والے لوگ زیادہ تر اسی پہلے سوال پر لکھتے اور بولتے ہیں جب کہ میرے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے نقصان سے بچایا جائے۔ فساد کس نے شروع کیا۔ یہ ایک خالص نظری نکتہ ہے۔ مگر فساد کیسے روکا جائے یہ ایک عملی سوال ہے اور اس کا براہ راست تعلق مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت سے ہے۔ مجھ کو اصلاً اسی سے دلچسپی ہے کہ مسلمانوں کی جان اور ان کے اموال محفوظ ہوں اور وہ اس ملک میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکیں۔

اس نقطۂ نظر سے جب میں سوچتا ہوں تو اس کا جواب مجھے قرآن میں واضح لفظوں میں ملتا ہے۔ قرآن کا وہ جواب یہ ہے: وان تصبروا وتتقوا لایضرکم کیدھم شیئاً (آل عمران ۱۲۰) قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے کید یا سازشی منصوبوں سے بچنے کا یقینی فارمولا یہ ہے کہ اس

کے مقابلہ میں صبر اور تقویٰ کا انداز اختیار کیا جائے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد زیادہ تر جلوس کے سوال پر ہوتا ہے۔ مسلمان اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ہندو اپنے جلوس کی روٹ بدلنے پر راضی نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تکرار ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے فساد بن جاتی ہے۔ قرآن کی مذکورہ رہنمائی کی روشنی میں دیکھئے تو اس مسئلہ کا حل صبر و اعراض ہے نہ کہ ٹکراؤ۔ یعنی مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ جلوس کے معاملہ میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کریں۔ جلوس کا مسلم محلّہ سے گزرنا صرف ایک وقتی مسئلہ ہوتا ہے۔ جلوس کے دونوں طرف ہمیشہ پولس موجود ہوتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ جلوس کے لوگ محلّہ کے اندر داخل نہ ہوں، وہ سڑک سے گزرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہر موقع صرف چند منٹ کے صبر و اعراض کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر مسلمان ایسے موقع پر تھوڑی دیر کے لئے صبر اعراض کا ثبوت دیں تو انہیں بیک وقت دو فائدے حاصل ہوں گے، ایک صبر کا ثواب جو قرآن کے الفاظ میں بے حساب حد تک ایمان والوں کو ملتا ہے (الزمر ۱۰)۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ان کا یہ وقتی اعراض فرقہ وارانہ فساد کے بم کو پھٹنے سے پہلے ہی ڈیفیوز کر دے گا اور مسلمان جان و مال کے نقصان سے بچ جائیں گے۔ جو لوگ ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ الرسالہ میں بار بار ایسی واقعاتی مثالیں شائع کی جاتی رہی ہیں جب کہ صرف صبر و اعراض کرنے کی وجہ سے فرقہ وارانہ فساد ٹل گیا اور مسلمان جان و مال کے نقصان سے مکمل طور پر محفوظ رہے۔ اس معاملہ کی مزید تفصیل ہماری کتاب (حل یہاں ہے) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب اس مسئلہ کو لیجئے کہ اس معاملہ میں الرسالہ میں جو مضامین آتے ہیں ان میں زیادہ تر مسلمانوں کی کوتاہیوں کا ذکر ہے اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یہی قرآن کا اسلوب ہے۔ قرآن میں ایک مستقل معاشرتی اصول یہ بتایا گیا ہے کہ تم پر (دوسروں کی طرف سے) جو مصیبت بھی آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰)۔ اسی اصول کی روشنی میں قرآن میں کم از کم دو بار صحابہ کو ان کی داخلی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی گئی جب کہ معاملہ بظاہر نہ صرف یکطرفہ تھا بلکہ اغیار کے ظلم و زیادتی کا ثبوت بھی وہاں موجود تھا۔

یہ دونوں حوالے غزوۂ احد وحنین سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے کہ غزوۂ احد سراسر قریش کی ظالمانہ کاروائیوں کی بنا پر پیش آیا تھا۔ ان کی یکطرفہ جارحیت اسی سے ثابت ہے کہ وہ مکہ سے اقدام کر کے مدینہ پہنچے اور یہاں آکر بلا سبب مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے جس کے نتیجہ میں احد کی جنگ پیش آئی۔ اس میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ احد کے اس واقعہ پر قرآن میں تبصرہ نازل ہوا تو اس میں قریش کے خلاف سخت بیان دینے کے بجائے خود اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی قرآن میں ارشاد ہوا کہ یہ دراصل تمہارا باہمی نزاع (آل عمران ۱۵۲) تھا جس کی بنا پر تم کو احد کے موقع پر جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا اسلام کی تاریخ میں غزوہ حنین کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے غزوہ حنین قبیلہ ہوازن کی یکطرفہ جارحیت کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر قرآن میں جب غزوہ حنین پر تبصرہ نازل ہوا تو دوبارہ یہی ہوا کہ جارح قبیلہ کے خلاف بیان دینے کے بجائے خود اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حنین کے دن تمہارے اندر عُجب اور ناز (التوبہ ۲۵) پیدا ہو گیا تھا اور یہی تمہارے لئے نقصان کا سبب بنا۔

یہی قرآنی اسلوب ہے جس کو میں اپنی تحریروں میں اختیار کرتا ہوں۔ اگر فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ اس کو شروع کرنے والا کون تھا تو میرا جواب بھی وہی ہوگا جو دوسرے مسلم رہنماؤں کا جواب ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، اس طرح کے معاملات میں میرے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال کو کیسے محفوظ کیا جائے اور جب میں اس دوسرے سوال پر غور کرتا ہوں تو میں مجبور ہوتا ہوں کہ قرآن کی روشنی میں بات عرض کروں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

سوال

میرے بھائی صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آج کل کے مسلمانوں کو کس قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔؟ میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ

مسلمانوں کو حقیقت پسند بنایا جائے مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ براہ کرم آپ اس کا جواب فرمائیں اور اس مسئلہ کو واضح کریں۔ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

جواب

آپ نے مذکورہ سوال کا بالکل درست جواب دیا۔ رہنمائی کے سلسلہ میں صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی نظری یا تاریخی باتوں کو جانے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ زمانی حالات کیا ہیں اور زمانی حالات کے اعتبار سے لوگوں کو کس قسم کی رہنمائی دینے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز حوالہ یہ ہے کہ ایک عالم نے ایک فتویٰ دیا کہ المسح علی الخفین واجب (خفین پر مسح کرنا واجب ہے) لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اس کو وجوب کا درجہ کیوں دیا، جب کہ یہ ایک رخصت کا معاملہ ہے۔ عالم نے جواب دیا کہ موجودہ زمانہ میں لوگ خفین پر مسح کرنے میں کراہت محسوس کرنے لگے تھے، اس لئے میں نے اس کی اہمیت پر زور دینے کے لئے یہ فتویٰ دیا۔

اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر کیا کمی آگئی ہے کہ ترقی کی دوڑ میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حقیقت پسندانہ طرز فکر (realistic approach) ان کے اندر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان عام طور پر جذباتی انداز میں سوچنے لگے ہیں۔ وہ اکثر جذباتی فیصلہ کے تحت اقدام کرتے ہیں۔ حالات کا گہرا تجزیہ اور تعمیری منصوبہ بندی کا مزاج ان میں باقی نہیں رہا۔ یہی ان کے موجودہ مسائل کا اصل سبب ہے۔ ایسی حالت میں موجودہ مسلمانوں کے لئے جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ یقینی طور پر یہی ہے کہ ان کے اس مزاج کی تصحیح کی جائے۔ ان کے اندر سے جذباتیت کا مزاج ختم کیا جائے۔ اس کے بجائے ان کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔

اس مزاج کا ایک اور تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان عددی اعتبار سے بہت بڑی طاقت ہیں۔ مگر اپنی بے اتحادی کی بنا پر وہ صرف ایک کمزور قوم بنے ہوئے ہیں۔ اس بے

اتحادی کا واحد سبب یہی جذباتیت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ معمولی اختلاف پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اختلاف کے وقت اپنا اعتدال کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اس شخص کے دشمن بن جاتے ہیں جو کوئی ایسی بات کہے جس سے وہ اختلاف رکھتے ہوں۔

فرق اور اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ وہ ہر سماج میں اور ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق و اختلاف کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی ان کے اندر بہت سے اختلاف تھے۔ موجودہ دنیا میں اتحاد ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر اختلاف کو برداشت کرنے کا مزاج ہو۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا، کیوں کہ غیر اختلافی سماج تو دنیا میں کبھی بنایا ہی نہیں جاسکتا۔

سوال

قرآن میں آیا ہے کہ تم صبر کرو جس طرح اولوالعزم انبیاء نے صبر کیا اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ (الاحقاف ۳۵) اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تفصیل فرمائیں۔

(اسجد نواز صابری، ہلمل، بہار)

جواب

عزم کا مطلب پختہ ارادہ (**determination**) ہے۔ یعنی اپنے مقصد پر پوری طرح جمے رہنا، کسی بھی چیز کا اثر لے کر اپنے مقصد سے منحرف نہ ہونا۔ اس آیت میں داعی کا کردار بتایا گیا ہے۔ داعی سے جو کردار مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے خواہ کتنا ہی زیادہ منفی ردّعمل کا اظہار ہو۔ مگر داعی اپنے مثبت رویہ پر قائم رہے۔ مدعو اگر اشتعال دلائے تب بھی داعی مشتعل نہ ہو۔ مدعو اگر قابل نفرت سلوک کرے تب بھی داعی اس کا خیر خواہ بنا رہے۔ مدعو اگر نزاع چھیڑے تب بھی داعی اس سے اعراض کرتے ہوئے لڑائی کی نوبت نہ آنے دے۔ یہی عزیمت ہے اور دعوت کا کام اس عزیمت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

سوال

میرے ایک عزیز نے مجھے تین سو صفحہ کی ایک کتاب دی۔ اس کا نام 'نماز نبوی' ہے۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر یہ حدیث لکھی ہوئی ہے کہ: اُس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ جن صاحب نے مجھ کو یہ کتاب دی انہوں نے کہا کہ عرب میں زیادہ تر لوگ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق، مرد و عورت کے نماز پڑھنے کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہر رکعت کے شروع میں رکوع اور سجدہ سے پہلے ''رفع یدین'' (دونوں ہاتھ کندھوں اور کانوں تک اٹھانا) کرنا ہے۔ عشاء کی وتر کی تیسری رکعت میں دعاء قنوت کی جگہ ایک اور دعا کا پڑھنا ہے۔ اس طرح کے کئی طریقوں پر زور دیا گیا ہے جو ہم لوگوں کی نماز سے الگ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کتاب میں بتایا ہوا طریقہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ ہے اور کیا مجھ کو اپنے موجودہ حنفی طریقہ کو چھوڑ کر اس کتاب میں بتائے ہوئے طریقہ پر نماز پڑھنا چاہیئے؟ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

جواب

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صلوا کما رایتمو نی اصلی (اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات عمومی مفہوم میں ہے نہ کہ کلی مفہوم میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی ادائیگی کے اعتبار سے تم لوگ میرے طریقہ پر نماز پڑھو۔ جہاں تک جزئی پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ خود رسول اللہ صلہ اللہ علیہ وسلم کے یہاں مختلف ہے۔ اس لئے آپ کے اس قول کو کلی مفہوم میں لینا ممکن ہی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ اس کو معلوم کرنے کا ذریعہ آپ کے اصحاب کی روایتیں ہیں۔ اصحاب رسول کی یہ روایتیں حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اصحاب رسول نے آپ کی نماز کے جو طریقے بتائے ہیں وہ سب کے سب یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں بہت سے فرق ہیں۔

ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نماز کے کچھ اجزاء کے بارے میں تمام صحابہ متفق الرائے ہیں۔ مثلاً فجر کی دو رکعت، ظہر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت۔ اسی طرح ہر رکعت میں رکوع ایک بار اور سجدہ دو بار۔ یہ اجزاء وہ ہیں جن میں کسی بھی صحابی کا کوئی اختلاف منقول نہیں۔ مگر نماز کے کچھ اور اجزاء ہیں جن میں خود صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی روایت سے آمین بالجہر کا ثبوت ملتا ہے تو کسی روایت سے آمین بالسر کا۔ کسی روایت میں رکوع اور سجدہ کے لئے ایک ذکر ہے تو دوسری روایت میں دوسرا ذکر، وغیرہ۔

آپ نے مذکورہ کتاب میں رسول اللہ کی نماز کا جو طریقہ پڑھا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں صرف اسی طریقہ کا تذکرہ ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔ ''نماز نبوی'' کی یہ تصویر انتخابی طور پر بنائی گئی ہے نہ کہ کلی طور پر۔ یعنی کچھ روایتوں کو لے کر کہہ دیا گیا کہ یہ نماز نبوی ہے اور اس کے برعکس دوسری روایتوں کو یا تو لیا نہیں گیا یا یہ کہہ دیا گیا کہ وہ یا تو منسوخ ہیں یا مرجوح ہیں یا غیر افضل ہیں۔ ترجیح کا یہی خود ساختہ اصول حنفی لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور غیر حنفی لوگ بھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتب حدیث کی جن روایتوں کو منسوخ یا مرجوح یا غیر افضل قرار دیا جاتا ہے، ان کی اس نوعیت کا علم کہاں سے ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خود روایت کے متن سے ان کی یہ نوعیت ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دعویٰ تمام تر فقہاء کے اپنے قیاس پر مبنی ہے اور عبادت کے معاملہ میں قیاس قابل اعتبار نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ قیاسی فقہ تبع تابعین کے دور میں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں نماز نبوی کی انتخابی تصویر کا طریقہ رائج ہی نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں بھی طریق نماز میں یہ اختلاف عملاً موجود تھے۔ مگر وہ لوگ یہ نہیں کرتے تھے کہ مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو درست قرار دینے کی کوشش کریں، بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ مختلف صحابہ میں سے جس صحابی کے طریقہ کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پر ہوگے اور تمہاری نماز درست نماز قرار پائے گی۔

اصل یہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے نماز کے دو حصے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ارکانِ نماز اور دوسرے کو آدابِ نماز کہا جاسکتا ہے۔ ارکان سے مراد نماز کے وہ اجزاء ہیں جن میں تمام صحابہ متفق ہیں اور جن میں تمام صحابہ کی روایتیں ایک ہی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں آداب سے مراد نماز کے وہ جزئی پہلو ہیں جن میں صحابہ کی روایتوں میں فرق واختلاف پایا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ارکانِ نماز میں توحدّ (یکسانیت) مطلوب ہے اور آداب نماز میں تنوع۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ مختلف روایتوں میں سے کچھ روایتوں کو چھوڑتے ہیں اور کچھ روایتوں کو لیتے ہیں اور پھر اپنی منتخب روایتوں کی بنیاد پر ایک تصویر بنا کر کہتے ہیں کہ یہ نماز نبوی (صلاۃ النبی) ہے۔ ان لوگوں سے کہا جائے کہ جن ثابت شدہ روایتوں کو آپ نے چھوڑا ہے وہ بھی تو آخر نمازِ نبوی ہی کا حصہ ہیں۔ اسکے جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کیلئے ایسا کیا۔ مگر ''بیان جواز'' کا یہ نظریہ قیاسی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب نماز کا کوئی واحد معین طریقہ مطلوب تھا تو اسکی کیا ضرورت تھی کہ ''بیان جواز'' کے لئے ایک مختلف طریقہ کا نمونہ قائم کیا جائے۔ وہ چیز جو ارکان نماز کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں آپ نے بیان جواز کی خاطر کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ پھر بیان جواز کا اصول ارکانِ نماز میں غیر مطلوب تھا وہ آدابِ نماز میں کیوں مطلوب ہوگیا۔

اس معاملہ کی نوعیت امام شافعی کے قول سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ خود بھی انہوں نے انتخابی اصول کو استعمال کرتے ہوئے نمازِ نبوی کی ایک تصویر بنائی۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ: رایی صواب یحتمل الخطاء ورای غیری خطاء یحتمل الصواب (میری رائے درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور میرے علاوہ کی رائے غلط ہے احتمال صحت کے ساتھ)۔

انتخابی تصویر بنانے کی ساری کوشش کے بعد بھی کیا وجہ ہے کہ دونوں فریقوں کے حق میں صرف احتمال خطا یا احتمال صواب ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فریق جب کچھ منتخب روایتوں کو لے کر اپنی تصویر مکمل کرتا ہے تو اُس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری تصویر کے علاوہ

بھی بہت سی مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں تطبیق کا فارمولا وہ نہیں ہے جو امام شافعی نے اپنے مذکورہ قول میں پیش کیا۔ اس کے بجائے تطبیق کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ آدابِ نماز میں فرق واختلاف کے معاملہ کو تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔

آخری بات یہ ہے کہ آداب نماز کے معاملہ میں روایتوں کا اختلاف کوئی نقص کی بات نہیں بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ نماز کوئی مشینی عمل نہیں، وہ کیفیت کے ساتھ ادا کیا جانے والا ایک روحانی عمل ہے۔ مشینی عمل میں کلی یکسانیت ہوسکتی ہے مگر کیفی عمل میں کلی یکسانیت ممکن نہیں۔ کیفی عمل میں بنیادی ارکان کے اعتبار سے تو ضرور یکسانیت ہوگی مگر اس کے جزئی پہلوؤں میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ فرق ہوجائے گا اور یہ فرق عبادت گذار کی داخلی کیفیت کی بنا پر ہوگا۔

داخلی کیفیت کے اعتبار سے نماز کے جزئی پہلوؤں میں فرق ہونا خود احادیث سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحابی کا رکوع سے اٹھنے کے بعد خلاف معمول طور پر یہ کہہ اٹھنا: ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیبا مبارکا فیه، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی تصدیق فرمانا، وغیرہ۔

سوال

غیر مسلم لوگ ہم سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ تمہارے مذہب میں باپ کے مرنے کے بعد پوتا حق وراثت سے محروم کردیا جاتا ہے یہ تو بڑا ظلم ہے۔ اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

(عبدالسلام، ڈھاکہ، بہار)

جواب

محجوب پوتے کی وراثت کا جو مسئلہ فقہ میں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ محجوب پوتے کو وراثت ہی نہ دو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وراثتی نقشہ میں درمیانی لنک ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایسے پوتے کو ظاہری قانون کے اعتبار سے وراثت نہیں پہنچتی۔ ایسی حالت میں قانونی ڈھانچہ کو برقرار

رکھتے ہوئے دوسرے طریقہ سے اس کی تلافی کی جائے۔ تلافی کا یہ طریقہ وصیت کا اصول ہے۔ یعنی جہاں براہ راست قانونی لنک کے ذریعہ وراثت نہیں پہنچ رہی ہے وہاں دادا اپنے حق وصیت کو استعمال کرتے ہوئے مجوب پوتے کو اس کا واقعی حصہ دے دے۔ چنانچہ اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔

کچھ خاندان ایسے ہو سکتے ہیں جہاں مجوب پوتے کو وراثت نہ دی گئی ہو۔ مگر اس کا سبب سرکشی ہے نہ کہ قانون میں کوئی کمی۔ جن لوگوں کے مزاج میں سرکشی ہو وہ مجوب پوتے کے علاوہ دوسرے مسلّم معاملات میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ مثلاً بہنوں کو حق نہ دینا، جس کی مثالیں موجودہ مسلم معاشرہ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ حالاں کہ یہ شریعت سے انحراف کی بنا پر ہے نہ کہ شریعت کی پیروی کی بنا پر۔

سوال

آپ نے الرسالہ دسمبر ۹۷ء میں ''فطری روش'' کے تحت لکھا ہے کہ عرب جاہلیت کا یہ واقعہ دراصل فطرت انسانی کا واقعہ ہے، اس وقت عرب کے لوگ اپنی فطرت پر قائم تھے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ اگر عرب کے لوگ فطرت پر قائم ہوتے تو اُن کے دور کو 'دورِ جاہلیت' کے دور سے موسوم کیوں کیا جاتا اور پیغمبر اسلام کو دین فطرت کی عظمت ان کے دلوں میں بٹھانے میں جنگوں کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ______ معلوم ہوا کہ وہ لوگ غیر فطری زندگی گزارتے تھے، پیغمبر اسلام کی قربانیوں سے وہ فطری زندگی پر آئے۔ (امیر حمزہ، جامعہ سراج العلوم، کرما)

جواب

اسلام کے مقابلہ میں جب جاہلیت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اُس کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو اُردو زبان میں اس لفظ کا مستعمل مفہوم ہے بلکہ اس کا مطلب ہوتا ہے، بے خبری (ignorance)۔ اس سے مراد ظہور اسلام سے پہلے کا دور ہے جب کہ اہل عرب وحی اور نبوت سے بے خبر تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جن عربوں (بنو اسماعیل) کے درمیان بھیجے گئے ان کے بارے میں

وہ بات خود احادیث سے ثابت ہے جس کا تذکرہ آپ نے الرسالہ میں پڑھا۔ احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خیارِ عرب میں مبعوث فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر اسلام سے پہلے اعلیٰ انسانی صفات (**human qualities**) موجود تھیں۔ حدیث کی زبان میں، اسلام نے ان کے اندر فقہ (شعور ایمان) کا اضافہ کیا۔ اس طرح جاہلیت کے بہترین لوگ اسلام میں بہترین لوگ بن گئے (**خیار کم فی الجاهلیة خیار کم فی الا سلام اِ ذافقهوا**)۔

عرب کے یہ لوگ جو اسلام میں آنے کے بعد بہترین امت بن گئے، وہ کسی پُراسرار قسم کی قربانی کے ذریعہ نہیں بنے۔ بلکہ دعوتی جدوجہد کے ذریعہ بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ اور قرآن کے مطالعہ نے ان کے اندر حق کا شعور پیدا کیا۔ ان کے اندر ذہنی بیداری آئی۔ اس طرح انہوں نے معرفت (دریافت) کے طور پر اللہ کے دین کو پایا۔ یہ مکمل طور پر فکری انقلاب (**intellectual revolution**) کے ذریعہ پیش آنے والا ایک واقعہ تھا نہ کہ کسی پُراسرار قربانی کے ذریعہ پُراسرار طور پر پیش آنے والا کوئی واقعہ۔

سوال

آپ کی تحریروں کے ذریعہ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ کسی بھی اسلامی دور میں متروک نہیں رہا ہے اور آپ کی تحریروں سے بعض لوگوں کے اس استنباط کی بھی تردید ہوتی ہے کہ دعوتی ودینی نقطۂ نظر سے امت مسلمہ پر طویل ''قرون مظلمہ'' کا دور گذرا ہے۔ میرے اس خط کا موضوع صوفیائے کرام کی تبلیغی ودعوتی کوشش ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ۱۲۰۰ء کے بعد جب کہ صوفی تحریک کو عالمگیر فروغ حاصل ہوا، کیا اس دور میں بھی صوفیائے کرام نے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام نہیں دیا ہے؟ اس ضمن میں میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ (شکیل احمد فاروقی، مہاراشٹر)

جواب

یہ بات صحیح ہے کہ حضرات صوفیاء نے براہ راست طور پر دعوتی کام نہیں کیا۔ یعنی وہ ایسا نہیں کرتے تھے کہ غیر مسلموں کے پاس جا کر کہیں کہ: **ایها النـاس قولوا لا اله الا الله تفلحوا**۔

صوفیاء کا جوکارنامہ ہے اس کو معاونِ دعوت کارنامہ کہا جاسکتا ہے نہ کہ براہ راست دعوت وتبلیغ کا کارنامہ۔

اصل یہ ہے کہ دوراول کے بعد اسلام عالمی طور پر ایک معروف دین بن گیا تھا۔ مزید یہ کہ اپنی فطری سادگی کی بنا پر اس کے اندر ہر انسان کے لئے کشش تھی۔ اس طرح اسلام کے اندر اپنے آپ لوگوں کے دلوں مین نفوذ کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت ایک عمل (process) کے روپ میں خود اپنے زور پر مسلسل ہونے لگی۔ دوراول کے بعد کی تاریخ میں اسلام اسی طرح اپنے آپ پھیلتا رہا۔

صوفیاء کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ منفی کام نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے نادان مسلم لیڈروں نے کیا۔ ان لیڈروں نے قومی تحریکیں چلا کر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مصنوعی طور پر تناؤ کا ماحول پیدا کر دیا اور اس طرح داعی اور مدعو کے درمیان نفرت پیدا کر کے اسلام کے اشاعتی عمل میں رکاوٹ ڈال دی۔ صوفیاء نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی عمل سے مکمل طور پر بچایا۔ انہوں نے اپنے مخصوص طریقہ کے ذریعہ مختلف فرقوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی فضا قائم کی۔ اس طرح معتدل اور خوشگوار تعلقات کے درمیان جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کا اختلاط بڑھا تو اپنے آپ اسلام بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ صوفیاء کی براہِ راست تبلیغ کے بغیر لوگ جوق در جوق آکر صوفیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔

مدنی دور میں صلح حدیبیہ کے بعد ہی یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اسلام کی اشاعت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں یا داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی نہ ہو اور معتدل فضا میں اختلاط (interaction) ہونے لگے تو اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔ صوفیاء نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی امکان کو استعمال کیا جو بدقسمتی سے کوئی دوسرا مسلم گروہ استعمال نہ کر سکا۔

سوال

اس وقت عالم اسلام جن مسائل سے دوچار ہے ان میں شاید سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ ہے کہ مختلف مکاتب کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی اور تکفیر تک کرتے رہتے ہیں جو اتحاد بین المسلمین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں خود ایک گروہ سے وابستہ ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں مگر دوسرے کچھ گروہ اس کی تکفیر کرتے ہیں، اس معاملہ میں آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ (محمد جنید احمد حقانی، اسکاسٹ، کشمیر)

جواب

موجودہ قسم کی تکفیر کا طریقہ جو کچھ مسلمانوں میں رائج ہے، وہ یقیناً غلط ہے۔ یہ ایک بدعت ہے۔ صحابۂ کرام کے دور میں اس قسم کی تکفیر کا رواج بالکل نہ تھا اور جس طریقہ کا رواج صحابہ کرام کے یہاں نہ پایا جائے وہ بلاشبہہ قابل رد ہے۔

ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کا طریقہ سلطنت عباسی کے دور میں شروع ہوا۔ یہ طریقہ چند سو سال تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں لوگوں کو اس سے دلچسپی نہ رہی کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کریں۔ اس کے بجائے وہ اس نامحمود عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دیں۔ تکفیر کا یہ طریقہ چند سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ علماء نے اس سلسلہ کو بند کرنے کے لئے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کریں گے۔ (لا نکفر احدا من اهل القبلة)۔

حقیقت یہ ہے کہ تکفیر و تفسیق کے موجودہ ہنگامہ کا کوئی بھی شرعی جواز نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ گویا ایک مذہبی گالی گلوج ہے نہ کہ کوئی مطلوب مذہبی عمل۔

سوال

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے۔ علماءِ کرام اور دانشوران اسلام اگر اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام غیر مسلم حضرات تک حکمت کے ساتھ پہنچائیں تو امید ہے کہ غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد اسلام کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھے گی اور قرآن پاک جیسی کتاب کو جلانے کے بجائے اسے سینے سے لگائے گی اور اس کا مطالعہ

کرے گی تو قبولیت اسلام کے لئے بھی تیار ہوجائے گی۔ مگر اس معاملہ میں اس قدر کوتاہی برتی جارہی ہے کہ جیسے یہ کرنے کا کوئی کام ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں کن لوگوں کو کن حکمتوں کے ساتھ یہ کام کرنا چاہیئے؟ (شکیل احمد فارمیسسٹ، بھنڈارہ)

جواب

موجودزمانہ کے مسلمان جو معمولی معمولی واقعات پر مشتعل ہوکر جلوس نکالتے ہیں اور جلاتے پھونکتے ہیں وہ ایک جرم ہے نہ کہ کوئی اسلامی خدمت۔ موجودہ مسلمانوں کی یہی منفی ذہنیت اسلام کی توسیع واشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا آغاز انسانی خیر خواہی سے ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی تاجر صرف اس وقت کامیاب تجارت کرسکتا ہے جب کہ وہ اپنے گاہکوں کا خیرخواہ ہو اور ان سے محبت اور رعایت کا تعلق قائم کرے۔ اسی طرح دعوتی عمل کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لئے خیرخواہی ہو۔ وہ سارے انسانوں سے محبت کرنے والا ہو نہ کہ صرف اپنی قوم سے محبت کرنے والا۔ یہ حقیقت ہے کہ دعوت کا کام احترام کے اصول پر قائم ہوتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف احترام مسلم سے واقف ہیں، وہ احترام انسان سے واقف نہیں۔ یہی وہ اصل حکمتِ دعوت ہے جس کے زندہ ہونے پر دعوت کا عمل جاری ہوسکتا ہے۔

سوال

چندروز قبل میں اپنے ایک دوست سے سیاسی اقتدار کی حقیقت کے بارے میں بات کررہا تھا۔ گفتگو کے دوران میرے دوست نے کہا کہ موسیٰ کی دعوت پر فرعون نے کہا تھا کہ یہ (موسیٰ) ہمیں اپنے اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں تو کیا فرعون کے اس قول سے سیاسی اقتدار کا نشانہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ فرعون جو موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب تھا اس کے اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تحریک سیاسی انقلاب کی تحریک تھی جس سے فرعون اپنے لئے سیاسی خطرہ محسوس کررہا تھا۔ اس بناپر اس نے ایسا کہا۔ (جاوید حسین وانی، اننت ناگ، کشمیر)

جواب

فرعون کا قول ''یرید ان یخرجکم من ارضکم ''الاعراف اور الشعراء میں آیا ہے۔ اس آیت سے یہ نظریہ نکالنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن ایک سیاسی مشن تھا، بلاشبہہ ایک مجرمانہ جسارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ یہ فرعون کے قول سے موسیٰ علیہ السلام کا مشن نکالنا ہے۔ جب کہ حضرت موسیٰ کا پیغمبرانہ مشنقولِ موسیٰ سے نکلے گا، نہ کہ قولِ فرعون سے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہایت غیر منطقی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کشمیریوں کے ایک مخالف شخص کے قول سے کشمیریوں کا مقصد متعین کیا جائے۔ اپنے ذاتی معاملہ میں کوئی بھی اس قسم کے غیر منطقی استدلال کو تسلیم نہیں کرے گا۔ پھر قرآن کے معاملہ میں ایسا استدلال کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر حضرت موسیٰ کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کو تخت سے بے دخل کر کے مصر میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کریں تو حضرت موسیٰ نے نعوذ باللہ، خود اپنے مشن کے خلاف عمل کیا۔ کیوں کہ جب فرعون اور اس کا لشکر مکمل طور پر تباہ ہوگیا تو اس کے بعد حضرت موسیٰ کے لئے بہترین موقع تھا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ واپس آکر مصر کے اقتدار پر قبضہ کرلیں۔ مگر اس کے برعکس حضرت موسیٰ نے یہ کیا کہ وہ مصر کو چھوڑ کر اپنی قوم کے ساتھ صحرائے سینا کے غیر آباد علاقے میں چلے گئے۔ مذکورہ سیاسی تفسیر کو ماننے کی صورت میں حضرت موسیٰ کے اس عمل کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

اس قسم کے واضح حقائق کے باوجود جو لوگ حضرت موسیٰ کے مشن کو سیاسی مشن بتائیں وہ صرف اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ قرآن کے اس حکم پر عمل کیا جائے: **واعرض عن الجاهلين**

سوال

میں دبئی میں رہتا ہوں۔ وہاں میری ملاقات اکثر پاکستانی لوگوں سے ہوتی ہے۔ ان کو میں ماہنامہ الرسالہ اور الرسالہ کی دوسری مطبوعات پڑھنے کو دیتا ہوں۔ یہ لوگ عام طور پر اس کو پسند کرتے ہیں مگر اکثر پاکستانی مسلمان ایک شبہہ کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تک ہم یہ جانتے تھے کہ اسلام کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل سیاسی نظام ہے اور ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جہاد

کر کے اس سیاسی نظام کو قائم کریں۔ مگر الرسالہ اور الرسالہ مطبوعات میں ہم کو اسلام کا یہ تصور نہیں ملتا آخر یہ فرق کیوں ہے؟ (ادریس محمد انصاری، دبئی)

جواب

یہ صرف پاکستانیوں کا مسئلہ نہیں۔ موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اسلام ایک سیاسی نظام ہے اور جہاد کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں سے لڑ کر اس سیاسی نظام کو قائم کیا جائے۔ مگر یہ ایک سیاسی بدعت ہے جو موجودہ زمانہ کے نام نہاد انقلابی مفکرین نے پھیلائی ہے۔ انہوں نے اسلام کو گھٹا کر اس کو صرف ایک سیاسی نظام بنا دیا ہے۔

They have reduced Islam to a mere political system.

اسلام کا یہ سیاسی تصور صرف ایک ردّ عمل ہے جو موجودہ حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ وہ یقینی طور پر قرآن اور سنت سے ماخوذ نہیں۔ قرآن وسنت کے مطابق، اسلام ایک ربانی نظام کا نام ہے نہ کہ کسی سیاسی نظام کا نام (آل عمران ۷۹)

اسلام کا مقصد ہر انسان کے دل میں اللہ کا خوف اور محبت پیدا کرنا ہے نہ کہ اسلامی سیاست کے قیام کے نام پر حکمرانوں سے لڑائی چھیڑنا اور پورے سماج کو تشدد کا جنگل بنا دینا۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد انقلابی مفکرین کے پیرو دنیا کے بہت سے ملکوں اور علاقوں میں انجام دے رہے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی سیاست ہر جگہ عملاً وہی چیز بن گئی ہے جو قرآنی اصول کے مطابق، ایک فسادی سیاست ہے (البقرہ ۲۰۵)۔

اسلام کا آغاز اللہ کی ذاتی معرفت سے ہوتا ہے۔ اسلام ایک ایسے شعوری واقعہ کا نام ہے جب کہ ایک آدمی اللہ کو اس کی ذات اور صفات کے ساتھ دریافت کرے اور اپنے قلب اور دماغ کے ساتھ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائے۔ وہ اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لے۔

اسلام کی معرفت یا اسلام کی دریافت کے بعد آدمی کے اندر ایک زبردست تبدیلی آتی ہے۔ وہ اللہ کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ اپنے نفع اور نقصان، اپنی نفرت اور محبت، غرض اپنے ہر قول اور

فعل کواللہ کیلئے خاص کر دیتا ہے۔وہ غیر اللہ سے یکسو ہوکر صرف ایک اللہ کا عبادت گزار بن جاتا ہے۔

اسی طرح اس کا اجتماعی سلوک مکمل طور پر اللہ کے تابع ہوجاتا ہے۔لوگوں کے ساتھ اس کا اخلاق،لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات،لوگوں کے ساتھ اس کا لین دین،سب اللہ کے حکم کی روشنی میں انجام پانے لگتے ہیں۔اس کے ہر قول اوراس کے ہر فعل میں اللہ کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ایسا آدمی اپنے خاندان کے اندر خاندان کا ایک اچھا ممبر بن جاتا ہے۔سماج کے اندر وہ اس کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ملک کے اندر وہ قانون کی پابندی کرنے والا اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے والا ایک شہری بن جاتا ہے۔زندگی کی جس سطح پر بھی دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوتا ہے وہ لوگوں کے لئے ایک سچا انسان ثابت ہوتا ہے۔یہی اصل اسلام ہے۔

جہاں تک حکومت اور اقتدار کا تعلق ہے،وہ قرآن کے مطابق،امر مقصود نہیں،بلکہ وہ امر موعود ہے۔(النور۵۵)اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول اسلامی تحریک کا نشانہ نہیں ہے۔اسلامی تحریک کا نشانہ اصلاً صرف دو چیزیں ــــــ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا اور جو لوگ اللہ کے پیغام کو قبول کرلیں ان کی تعلیم وتربیت کرنا (لتنذربه و ذكرىٰ للمؤمنين) قرآن کے مطابق،سیاسی اقتدار امتحان کے پرچوں میں سے ایک پرچہ ہے۔جس طرح مال کسی ایک ہی شخص یا ایک ہی گروہ کو نہیں دیا جاتا بلکہ ہر ایک کو دیا جاتا ہے تا کہ ہر ایک کی آزمائش ہو سکے۔یہی معاملہ سیاسی اقتدار کا بھی ہے۔سیاسی اقتدار بھی مختلف لوگوں کو باری باری دیا جاتا ہے۔سیاسی اقتدار کسی فرد یا گروہ کی ابدی وراثت نہیں۔کسی ایک کو مستقل طور پر سیاسی اقتدار کا مالک بنانا گویا دوسروں کو سیاسی آزمائش سے بری کرنا ہے۔

یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔قرآن کے مطابق ، فتح وشکست اور سیاسی غلبہ اور سیاسی مغلوبیت باری باری کبھی ایک کے حصہ میں آتی ہیں اور کبھی دوسرے کے حصہ میں (**تلك الايام نداولها بين الناس**)

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اقتدار کے معاملہ کو(عربی شکل میں) **أخرى (الصّف ۱۳)** کہا گیا ہے۔یعنی اصل اُخروی مطلوب کے علاوہ ایک اور چیز جو دنیوی حالات کے لحاظ سے درکار ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ سیاسی غلبہ یا سیاسی اقتدار کی حیثیت اسلام میں اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔

سوال

الرسالہ جون ۲۰۰۱ کے شمارہ میں ایک چیز میرے ذہن کو بہت زیادہ کھٹک رہی ہے۔ صفحہ ۴۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ ''گجرات میں غیر معمولی تباہی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے برسوں میں وہاں کثرت سے ایسے مکانات بنائے گئے جن کو (non-engineered construction) کہا جاتا ہے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ جس مقام میں معلوم طور پر زلزلہ آنے کا امکان ہو وہاں quake resistant مکان بنائے جائیں۔ اس طرح گجرات کی آفت کے ذریعہ قدرت کی طرف سے گویا یہ پیغام دیا گیا ہے کہ لوگ اپنے مکانات فن تعمیر کے اصول کے مطابق بنائیں''۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کے پاس ''کن فیکون'' کی ابدی طاقت ہے، اس کے نزدیک non-engineered construction اور quake resistant کا کوئی فرق نہیں، جو خدا قوم عاد اور قوم ثمود کے محلات کو تاخت وتاراج کرسکتا ہے جو ''ارم ذات العماد لم یخلق مثلھا فی البلاد'' تھے، اس ذات قہار کے نزدیک مذکورہ باتیں چہ معنی دارد است؟ (جمیل احمد عباس، چکنوٹہ، ویشالی، بہار)

جواب

الرسالہ میں جو بات لکھی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ خدائی عذاب کے مقابلہ میں کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک ہے، نظام فطرت کے تحت پیش آنے والے عام مسائل اور دوسری چیز ہے اللہ کے فیصلہ کے تحت پیش آنے والا غیر معمولی واقعہ جس کو عذاب کہا جاتا ہے۔ الرسالہ کے مذکورہ شمارہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ اول الذکر صورت حال سے متعلق ہے، نہ کہ ثانی الذکر صورت حال سے متعلق۔

برسات کی بارش سے بچنے کے لئے آپ چھت بناتے ہیں اور وہ چھت آپ کو بارش کے مسائل سے محفوظ رکھتی ہے۔ مگر قوم عاد پر عذاب کی جو بارش برسائی گئی کوئی بھی چھت انسان کو اس

سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی طرح مخصوص حکمت کے تحت اللہ نے زمین کے اندر نہایت گرم لاوا رکھا ہے۔ اس کی مسلسل حرکت سے زمین پر ہر روز زلزلے آتے ہیں۔ عام حالات میں یہ زلزلے اتنے خفیف ہوتے ہیں کہ صرف آلات کی مدد سے ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ان میں تیزی آجاتی ہے اور زمین کے اوپر کا حصہ ہلنے لگتا ہے اس وقت ہم اس کو زلزلہ کہتے ہیں۔

جسطرح دوسرے فطری مسائل کے مقابلہ میں ہم بچاؤ کا انتظام کرتے ہیں۔ مثلاً بارش سے مقابلہ کیلئے چھت، سیلاب سے مقابلہ کیلئے بند، گرمی سے مقابلہ کیلئے سایہ، سرد موسم سے مقابلہ کیلئے گرم کپڑا، وغیرہ۔ اسی طرح زلزلہ سے مقابلہ کیلئے بھی مطالعہ اور تجربہ کے بعد مخصوص ٹکنیک دریافت کی گئی ہے اور اسکے استعمال سے مختلف ملکوں میں بچاؤ کا سامان کیا گیا ہے۔

مگر عذاب کا معاملہ اس قسم کے فطری مسائل سے نوعی طور پر مختلف ہے۔ عذاب ایک فیصلۂ الٰہی ہوتا جو بہر حال واقع ہو کر رہتا ہے۔ مگر ہم کو یہ حق نہیں کہ ذاتی قیاس کے تحت ہم کسی واقعہ کو عذابِ الٰہی کہیں۔ اس قسم کا اعلان صرف پیغمبر براہِ راست خدائی اطلاع کی بنا پر کر سکتا تھا۔ پیغمبر کے بعد اب کسی واقعہ کو خدا کا عذاب کہنا ایک ایسی جسارت ہے جس کا تحمل اللہ سے ڈرنے والا کوئی انسان نہیں کر سکتا۔

سوال

خدا کی حقیقت (وجود) سب سے افضل مانی جاتی ہے۔ لیکن شیطان برائی کرنے کے لئے انسان کو اکساتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر خدا بے بس لگتا ہے۔ شیطان کیسے خدا کے برابر طاقتور ہے؟ (بلراج اوبرائے، ریٹائرڈ جج، میرٹھ)

جواب

خدا انسان کا خالق ہے۔ خدا بلاشبہہ تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ شیطان کو دنیا میں بظاہر انسان کے اوپر جو اختیار حاصل ہے اسکا تعلق خدا کی طاقت سے نہیں ہے بلکہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) سے ہے۔ شیطان کو موجود دنیا میں جو اختیار حاصل ہے وہ اسلئے ہے کہ خدا نے اپنی امتحانی مصلحت کی بنا پر وقتی طور پر اس کو یہ موقع دیا ہے۔ شیطان کا اختیار اس کی ذاتی صفت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو خدا نے آزمائش (test) کی مصلحت کے تحت بنایا ہے یہاں انسان کو اس لئے بسایا گیا ہے کہ اس کو جانچ کر دیکھا جائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون انسان اپنے حسن عمل کی بنا پر اس قابل ہے کہ اس کو جنت کی ابدی دنیا میں بسایا جائے اور جو لوگ اپنی بدعملی کی بنا پر نالائق ثابت ہوں ان کو جنت سے محروم کر کے کائنات کے ابدی کوڑا خانہ میں ڈال دیا جائے۔

موجودہ دنیا کا پورا نظام اسی آزمائشی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔ موجودہ دنیا کی صحیح توجیہہ صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ اس کو اسی روشنی میں دیکھا جائے اور اس کے واقعات کی توجیہہ اسی بنیادی اصول کی روشنی میں کی جائے۔ مثلاً انسان کو موجودہ دنیا میں جو اختیار ملا ہوا ہے وہ بھی اسی آزمائشی مصلحت کی بنا پر ہے۔ انسان کے اندر صحیح اور غلط کی تمیز کی جو صلاحیت ہے اس کا راز بھی یہی ہے۔ انہی میں سے ایک شیطان کا وجود بھی ہے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق، شیطان خفیہ نوعیت کی ایک مستقل مخلوق ہے۔ شیطان یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ انسان کو بہکائے۔ وہ انسان کو اس طرح متاثر کرے کہ برائی اس کو خوبصورت دکھائی دے اور بھلائی اس کو بُری صورت میں نظر آئے۔ مگر شیطان کو انسان کے اوپر صرف بہکانے کا اختیار حاصل ہے۔ شیطان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ انسان کے ساتھ زبردستی کرے یا اس کو غلط راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر سکے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسے امتحان ہال میں کسی طالب علم کا معاملہ۔ طالب علم کو امتحان ہال میں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی کاپی پر جو چاہے لکھے اور جو چاہے نہ لکھے۔ مگر یہ آزادی صرف تین گھنٹہ کے لئے ہے۔ تین گھنٹہ کا وقت پورا ہوتے ہی اس کی کاپی واپس لے لی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے تعلیمی مستقبل کا فیصلہ اس کی اسی کارگذاری پر کیا جاتا ہے جو اس نے تین گھنٹے کے ملے ہوئے وقت میں انجام دی تھی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا موجودہ دنیا میں ہے۔ کسی انسان کو عمر کا جو وقفہ ملا ہے وہ گویا اس کے لئے تین گھنٹہ کا وقفہ ہے۔ اس وقفۂ عمل کے دوران اس کو موقع ہے کہ وہ یا تو شیطان کے بہکاوے میں

آکر اپنا اعمال نامہ خراب کرلے یا اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو شیطان کے بہکاوے سے بچائے۔ وہ شیطان کو رد کر کے فرشتہ کی آواز کو سنے اور سچائی کے راستہ پر قائم ہو جائے۔ جو لوگ فرشتہ کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی کریں ان کے لئے خدا کا ابدی انعام ہے اور جو لوگ شیطان کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی کریں انکے لئے خدا کی ابدی سزا۔

شیطان کے بارے میں مذکورہ سوال صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ موجودہ دنیا ہی کو واحد دنیا سمجھا جائے۔ مگر جب دنیا کے ساتھ آخرت کی دنیا کو ملا لیا جائے تو یہ سوال اپنے آپ حل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کی دنیا اس کا بدلہ پانے کی جگہ۔ آخرت کی دنیا میں جو اعلیٰ انعام دیا جانے والا ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ اس قیمتی انعام کے مستحق صرف وہ بلند حوصلہ افراد ہوں گے جو شیطان کی ترغیبات (temptations) سے اپنے آپ کو بچائیں اور ہر ممکن قربانی دیتے ہوئے سچائی کے راستہ پر قائم رہیں۔ جن کی موت اس حال میں آئے کہ انہوں نے شیطان کے اوپر مکمل غلبہ پالیا تھا۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ الرسالہ، مارچ ۱۹۹۵ میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں یہ درج تھا کہ ''بندہ نے رمضان میں ایک مہینہ تک اللہ کے حکم کی تعمیل کی، تو اب اللہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے اپنے انعام کے طور پر بندہ کو یہ موقع دیا کہ وہ پابندیوں سے آزاد ہو کر جو چاہے کھائے اور جو چاہے پیئے'' (صفحہ ۱۸)۔ اس عبادت پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرام وحلال کی تمیز کئے بغیر جو چاہے کھاؤ جو چاہے پیؤ۔ میری سمجھ سے اس عبارت کو اس طرح ہونا چاہئے تھا: ''پابندیوں سے آزاد ہو کر اللہ کے دیے ہوئے مال حلال سے جو چاہے کھائے اور جو چاہے پیئے۔'' اگر عبارت اس طرح ہوتی تو لوگوں کو اعتراض کا موقع نہ ملتا۔ (سید آصف علی، پوسٹ بکس ۲۴۸۰۴، شارجہ)

جواب

یہ معاملہ عبارت میں غلطی کا نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی سوچ کی غلطی کا معاملہ ہے جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا۔ اگر کھلے ذہن کے ساتھ اس مضمون کو پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود اسی مضمون میں مذکورہ اعتراض کا جواب موجود ہے۔ آپ دوبارہ پورے مضمون کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں چند سطر پہلے یہ الفاظ چھپے ہوئے موجود ہیں ''رمضان کا مہینہ کھانے پینے پر پابندی لگانے کا مہینہ ہے اور عید الفطر کا دن ان پابندیوں سے آزاد ہونے کا دن ہے'' ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''پابندیوں سے آزادی'' سے مراد وہ پابندیاں ہیں جو روزہ کے دنوں میں عائد کی گئی تھیں، نہ کہ مطلق آزادی۔

یہ اعتراض نہیں ہے بلکہ شوشہ ہے اور شوشہ ہر عبارت میں نکالا جا سکتا ہے حتی کہ قرآن میں بھی جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: **واذا علم من آیا تنا شیئا ا تخذھا ھزو اً** (الجاثیہ ۹)

سوال

میری ملاقات ایک جماعت کے لوگوں سے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ وہ آپ پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ دعوت کی بات کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے کتنے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ الرسالہ کے خبر نامہ اسلامی مرکز میں تو ایسی خبریں موجود نہیں ہوتیں۔
(اقبال احمد فیضی، بھلائی)

جواب

سوال کرنے والے کے اندر اگر سنجیدگی ہو تو وہ اس سوال کا جواب خود ہی معلوم کر سکتا ہے۔ ہمارا مشن تقریباً چالیس سال سے چل رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ کے فضل سے ہم نے مختلف ملکوں کے لاکھوں انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا ہے۔ ان میں سے ہزاروں لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔ مگر میں اور میرے ساتھی یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لئے کر رہے ہیں اس لئے ہم اس کو خبر نامہ میں نہیں چھاپتے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس جماعت کے لوگ آپ سے اس قسم کے سوالات کرتے ہیں وہ اپنے نظریہ کے مطابق اس ملک کو دارالطاغوت سمجھتے رہے ہیں۔ اب وہ اس ملک کو دارالدعوہ کہتے ہیں اور اپنے دعوے کے مطابق دعوتی کام میں مصروف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دارالدعوہ کا یہ تصور ان کو کہاں سے ملا۔ یقینی طور پر وہ انہیں راقم الحروف کی تحریروں سے ملا۔ ان کے اپنے جماعتی نظریہ کے مطابق، تو یہ ملک ان کے لئے صرف دارالطاغوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ان کے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ وہ اس طاغوتی نظام سے لڑیں۔ پھر یا تو اسی راہ میں اپنی جان دے دیں یا اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کر دیں۔ ان کے مسلمہ عقیدہ کے مطابق، سیاسی نظام کو بدلے بغیر دعوت کے کام کا انجام پانا ممکن ہی نہیں۔

راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے ان حضرات کو بتایا کہ جس ملک کو تم غلط طور پر دارالطاغوت سمجھتے ہو وہ دراصل دارالدعوہ ہے یعنی یہاں آج بھی پرامن انداز میں دعوت کا عمل انجام دیا جاسکتا ہے۔

ان حضرات کے نظریہ کے مطابق، ہندوستان جیسے ملک میں ان کیلئے صرف دو ہی امکانی صورت تھی۔ ایک یہ کہ مفروضہ طاغوتی نظام سے لڑ کر اپنے کو ہلاک کرنا، یا منافقانہ سمجھوتہ کر کے اس کے اندر زندگی گزارنا۔ راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے ان کو اس دو طرفہ مصیبت سے نجات دی۔ ایسی حالت میں یہ حضرات میرے خلاف جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ بے حد سنگین ہے۔ اندیشہ ہے کہ ان کی یہ روش انہیں اس حدیث رسول کا مصداق بنا دے: **من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ** (احمد، الترمذی، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، جلد ۲ صفحہ ۹۱۱)

نادان نے کہا کہ..... میں نے اپنا ماضی اور حال دونوں برباد کر دیا

دانش مند بولا: مگر مستقبل تو برباد نہیں ہوا۔ (الرسالہ اکتوبر ۸۹)

سوال

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کاذبوں کو ڈھیل نہیں دیتا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ ----- اور وہ کوئی بات گھڑ کر ہمارے اوپر لگاتا۔ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم اس کی رگِ دل کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ (الحاقۃ ۴۴۔۴۷) اس صورت میں اگر مرزا غلام احمد قادیانی صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؟ (بہادر خاں، بارہ مولہ، جموں وکشمیر)

جواب

یہ ایک مغالطہ ہے، نہ کہ استدلال۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں نہیں کہا گیا ہے کہ ''جو لوگ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کریں'' بلکہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ ''اگر وہ بات گھڑتا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کا تعلق صرف ایک شخص، یعنی محمد بن عبداللہ سے ہے۔ اس آیت میں کوئی عام حکم بیان نہیں ہوا ہے۔ اس کا تعلق متعین طور پر ذات رسول سے ہے۔ آپ کے معاصرین آپ کے بارے میں اس قسم کا الزام لگاتے تھے، اس لئے اُن کے جواب میں یہ آیت اتاری گئی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اقرار یا انکار سے آپ کے معاصرین کی جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس لئے آپ کے بارے میں یہ سخت اعلان کیا گیا۔ جہاں تک جھوٹے مدعیان نبوت کا تعلق ہے ان کے مخاطبین کے بارے میں اللہ کی یہ سنت نہیں۔ ان لوگوں کا فیصلہ آخرت میں ہوگا، نہ کہ دنیا میں۔

سوال

میں بہار کے ایک میڈیکل کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کا طالب علم ہوں۔ یہ ایک اقلیتی ادارہ ہے جس میں ۵۰ فیصد سیٹ مسلمانوں کے لئے ریزرو ہے۔ یہ کالج A.I.C.T.E سے ریکگنایزڈ ہے اور وقتی طور پر مگدھ یونیورسٹی سے اس کا الحاق بھی ہے۔ مگر یونیورسٹی لڑکوں کا امتحان وقت پر نہیں لیتی۔ یونیورسٹی بار بار الزام عائد کرتی ہے کہ کالج ریگولر طریقہ پر نہیں چلتا ہے۔ اس لئے اس کا کوئی کام وقت پر کرنا مناسب نہیں۔ جب کہ کالج انتظامیہ کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی خود بدعنوانی کا

شکار ہے۔ میں دو سال سے فرسٹ ایر میں ہوں مگر ابھی تک امتحان ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس کے متعلق کئی بار گورنر اور وائس چانسلر سے بات ہو چکی ہے پھر بھی کوئی مثبت جواب نہیں مل پایا۔ اس حال میں ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ برائے کرم آپ کوئی مشورہ دیں (خالد علی خاں۔ بہار)

جواب

میں ذاتی طور پر رعایتی ادارے قائم کرنے کے خلاف ہوں اور رعایتی داخلہ کے بھی خلاف ہوں۔ میرے نزدیک زندگی مقابلہ کا نام ہے۔ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ مقابلہ کرو یا ختم ہو جاؤ: **compete or perish**۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اب سے یہ فیصلہ کریں کہ آپ محنت کے ذریعہ دنیا میں اپنا مقام بنائیں گے، نہ کہ رعایت کے ذریعہ۔ شکایت ہمیشہ رعایت چاہنے والوں کو ہوتی ہے۔ جو لوگ محنت کا طریقہ اختیار کریں، انہیں کبھی کسی سے شکایت نہیں ہوتی۔ جو لوگ رعایتی ادارے کھولتے ہیں، ریزرویشن کی اہمیت پر تقریریں کرتے ہیں وہ خود اپنے بچوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں جہاں سخت مقابلہ کا ماحول ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل مسئلہ کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ زندگی میں ترقی کرنے کا ہے۔

زندگی میں اعلیٰ ترقی کبھی رعایت اور رزرویشن کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ لیاقت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اعلیٰ لیاقت محنت سے آتی ہے نہ کہ رعایت سے۔

سوال

الرسالہ میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ظلم وزیادتی کے خلاف مسلمانوں کو صبر کی روش اختیار کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ظلم وزیادتی پر صبر کرنا تو ظلم وزیادتی کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس شبہہ کا کیا جواب ہے۔ (ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے ارشاد ہوا ہے کہ: ولنصبرن علی ما آذیتمونا (ابراہیم ۱۲) یعنی تمہاری ایذاؤں پر ہم صبر ہی کریں گے۔ اگر ظلم وزیادتی پر صبر کرنا

اس کو بڑھاوا دینے کے ہم معنیٰ ہوتا تو پیغمبروں کو کبھی اللہ کی طرف سے یہ تعلیم نہ دی جاتی جو مذکورہ آیت کے مطابق انہیں دی گئی۔

اصل یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ عام طور پر اس کے خلاف جوابی تدبیر کو تدبیر سمجھتے ہیں مگر یہ صرف ایک جذباتی ردّعمل ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ ایسے مواقع پر جوابی تدبیر صرف مسئلہ کو بڑھاتی ہے۔ وہ فریق ثانی کے اندر ضد اور انتقام کی آگ بھڑکا کر مسئلہ کو شدید تر بنا دیتی ہے۔ وہ کسی حال میں مسئلہ کا حل نہیں۔

صبر کا مطلب عدم عمل نہیں، صبر کا مطلب زیادہ مؤثر عمل ہے۔ صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی پیش آمدہ مسئلہ کو جذباتی تدبیر کے ذریعہ حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں صبر والا آدمی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بے صبری کا طریقہ ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور صبر کا طریقہ ہمیشہ کامیاب۔

اس معاملہ کی ایک معلوم اور معروف مثال یہ ہے کہ ہر سال ہندو لوگوں کی طرف سے گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔ ابتداءً مسلمان یہ کرتے تھے کہ گن پتی کا جلوس ان کی مسجد کے سامنے سے گذرتا تو وہ روک ٹوک کرتے۔ وہ جلوس کی روٹ بدلنے کی مانگ کرتے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا اور خونی فساد کی نوبت آجاتی۔ اب اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کی تعمیری مہم کے نتیجہ میں اس معاملہ میں مسلمان صبر و اعراض کی حکمت کو سمجھ گئے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ہر سال پہلے کی طرح گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔ جلوس والے اب بھی وہی کرتے ہیں جو وہ پہلے کرتے تھے۔ مگر اب کئی سالوں سے گن پتی کے جلوس کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد کا ہونا تقریباً بند ہو گیا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اب مسلمان گن پتی کے جلوس کے موقع پر صبر و اعراض کا فارمولہ اختیار کرتے ہیں، جب کہ اس سے پہلے وہ بے صبری اور جذباتیت کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

سوال

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے مسائل میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف ہے۔ مثلاً بعض روایتوں میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے اور بعض دوسری روایتوں میں ناف کے نیچے باندھنے کا۔ اس طرح کے اختلافات کی موجودگی میں **صلوا کما رایتمونی اصلی** کے حکم پر کس طرح عمل کیا جائے گا؟ (محمد امین گڈو، سری نگر، کشمیر)

جواب

اس طرح کے اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ آداب نماز میں توسع کا اصول ہے اس لئے تو حد کے اصول پر کوئی ایک نمونہ قائم کرنے کی کوشش درست نہیں۔ امام شافعی نے بجا طور پر کہا ہے کہ **رای صواب یحتمل الخطاء ورای غیری خطا یحتمل الصواب**۔ میری رائے درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور فریق ثانی کی رائے غلط ہے احتمال صواب کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں روایتوں کے اختلاف کو ایک ثابت کرنے کی ساری کوشش کے باوجود صرف احتمال ثابت ہوتا ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو توسع پر محمول کیا جائے اور میرے نزدیک یہی محدثین کا مسلک تھا۔

نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے خشوع کا ایک عمل ہے نہ کہ محض کچھ ظواہر کی صحت ادائیگی کا عمل۔ ایسی حالت میں ظاہری آداب میں فرق ہونا ایک فطری بات ہے۔ نمازی کو چاہیئے کہ اپنا سارا دھیان داخلی کیفیت پر دے، نہ کہ ظاہری ہیئت پر۔ چنانچہ ظاہری ہیئت کی صحت ادائیگی کے باوجود ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: **ارجع فصلّ فانک لم تصل** (جاؤ پھر سے نماز پڑھو، کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی)۔

ایک شخص نے کہا کہ شام ہوگئی

دوسرا شخص بولا یوں کہو کہ صبح ہونے والی ہے (الرسالہ اکتوبر ۸۷)

سوال

قرآن کریم کو جناب نے کتاب الصبر فرمایا ہے۔ یہ قول ان کے مقابلہ میں نہایت وزنی ہے جو اس کو کتاب الجہاد سمجھتے اور اسی انداز میں اس کو متعارف کراتے ہیں۔ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے تو میرے نزدیک کتاب الجہاد کہنا اگر افراط ہے تو کتاب الصبر قرار دینا تفریط۔ قرآن کے لئے اگر ہمیں اس طرح کی کسی وضاحت کی واقعی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے کتاب الاعتدال کہنا چاہیئے اور اس کے نتیجہ میں جو مذہب وجود میں آتا ہے اسے مذہب اعتدال سے متعارف کرایا جاسکتا ہے (محمد عمران مظاہری، مدرسہ حسینیہ، اغوان پور، میرٹھ)

جواب

آپ نے صبر کو بہت محدود معنیٰ میں لیا ہے اس لئے آپ نے ایسا فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد خود صبر ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں اہل ایمان کو سو میں ننانوے بار صبر کرنا پڑتا ہے اس کے بعد جہاد کا موقع آتا ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں ایمان کے تقاضوں پر زندگی گذارنے کے لئے صبر لازمی شرط ہے۔ مثلاً اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی صبر درکار ہے۔ کیوں کہ اگر آپ کھوئے ہوئے پر صبر نہ کریں تو ملے ہوئے پر حقیقی جذبہ شکر کا اظہار آپ کی زبان سے نہیں ہوسکتا۔ دعوت کے لئے صبر لازمی شرط ہے۔ کیوں کہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کئے بغیر آپ سچے داعی نہیں بن سکتے۔ نماز بھی آپ خشوع کے ساتھ صرف اس وقت پڑھ سکتے ہیں جب کہ آپ دینوی تقاضوں پر صبر کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں۔ انفاق بھی آپ اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ آپ مال کی محبت کے جذبات پر صبر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح حج مبرور بھی اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ سفر حج کے دوران پیش آنے والے مکارہ پر صبر کیا جائے۔ اسی طرح اسلامی اخلاق کے اصولوں پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں پر صبر کیا جائے۔

یہی معاملہ خود جہاد کا ہے۔ جہاد کا آغاز دوسروں کے خلاف قتال سے نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے نفس پر کنٹرول کرنے سے ہوتا ہے۔ مومن دوسروں کی قابل شکایت باتوں پر صبر کرتے

ہوئے اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتا ہے۔ مومن دوسروں کی زیادتیوں پر صبر کرتے ہوئے اس کو دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ مومن دوسروں کے جارحانہ عزائم کو یک طرفہ اعراض کے ذریعہ بے اثر بناتا رہتا ہے اور اگر بالفرض جنگ کی نوبت آجائے تب بھی مومن یہ کرتا ہے کہ وہ صرف حملہ آور پر ہاتھ اڑھاتا ہے۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو پھر بھی اپنی زد سے محفوظ رکھتا ہے۔ مومن اپنے منفی جذبات کو یک طرفہ طور پر دبا کر غیر حملہ آوروں کو نقصان پہنچانے سے بچتا ہے۔ صبر کی ان تمام کاروائیوں کے باوجود جو جہاد کیا جائے وہی دراصل اسلامی جہاد ہے۔ جہاد خود ایک صابرانہ عمل ہے نہ کہ غیر صابرانہ عمل۔ جہاد بامعنیٰ قتال ایک استثنائی حکم ہے اور صبر ایک عمومی حکم اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کا عنوان بحث عموم کے اعتبار سے کیا جائے گا، نہ کہ استثناء کے اعتبار سے۔

سوال

الرسالہ جولائی ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۳۳ تا ۳۵ میں آپ نے اکبر کی خود ساختہ پالیسی کو تالیف قلب کی گہری پالیسی قرار دیا ہے اور اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ اکبر نے اسے اسلام کی اشاعت میں برہمنوں کے ذریعہ پیدا کی گئی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ لیکن اس متنازع فیہ واقعہ کو آپ نے قرآن وسنت سے مدلل کرنے کے بجائے محض مولانا سید حسین احمد مدنی کی ''مجتہدانہ نظر'' سے مدلل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اکبر کا یہ اقدام اپنے سیاسی انٹرسٹ کی خاطر تھا نہ کہ اسلام کی خاطر۔ آپ کی اس بحث سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر مسلمان (یا کوئی مسلم حکومت) خالص مصلحتاً ہندوؤں یا غیروں کی چند بے ضرر رسومات کو اپنے یہاں رائج کرلیں تو یہ عین دین کی خدمت ہوگی۔ بالفاظ دیگر غیروں کی طرح مخصوص وضع قطع اختیار کرنا، دیوالی میں قندیلیں جلانا، ہولی میں رنگوں سے کھیلنا، کسی اچھے کام کا آغاز ناریل توڑ کر کرنا وغیرہ جیسی بے ضرر رسمیں، نہ صرف مسلمانوں کے لئے وقتی طور پر جائز ہوجاتی ہیں بلکہ وہ ضروری ہوجاتی ہیں۔ (محمد اقبال انجینئر، ایم اے صدیقی، فاروق فیصل، محمد رفیع چوگلے، ممبئی)

★★★

جواب

تالیف قلب دعوت اسلامی کا ایک مستقل اصول ہے۔ یعنی محدود دائرے میں مدعو کی وقتی رعایت کرنا جس سے وہ اسلام کی طرف مائل ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ہجرت کے بعد آپ نے ۱۶۔۱۷ مہینے تک یہودیوں کے قبلہ کو اپنا قبلۂ عبادت بنائے رکھا۔ اس کا سبب یہی تالیف قلب کا حکم تھا (تفسیر القرطبی ۲ر صفحہ ۱۵۰)

اکبر کا مذکورہ عمل اسی تالیف قلب کی بنا پر تھا۔ نیز یہ کہ اس معاملہ میں اکبر تنہا نہیں۔ ہندستان کے صوفیاء نے اسی تالیفِ قلب کے اصول کے تحت کئی طریقے اپنی خانقاہوں میں رائج کئے۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ملک کے لاکھوں باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اکبر نے جو طریقہ اختیار کیا، اگر بالفرض اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی توسیع واشاعت سے اس کی سلطنت کو استحکام حاصل ہوگا، تب بھی اس کا فعل قابلِ ملامت نہیں۔ اگر بالفرض ایسا ہو تو ہم صرف یہ کریں گے کہ اکبر کے فعل کو اس حدیث رسول کا مصداق قرار دیں گے: **ان اللہ لیؤید ھذاالدین بالرجل الفاجر۔**

الرسالہ کے مذکورہ شمارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد ہرگز نہیں کہ مسلمان ہندوؤں کے رسوم کو اپنی زندگی میں اختیار کر لیں۔ یہ مکمل طور پر ایک دعوتی بات ہے۔ اس کا تعلق صرف دعوتی مصالح سے ہے۔ کلچرل سمجھوتہ کا میں ہرگز مبلغ نہیں ہوں۔ میں صرف دعوتی مقصد کے لئے تالیفِ قلب کی بات کرتا ہوں۔ تالیفِ قلب بلاشبہہ اسلام کا ایک مسلم اصول ہے۔ ہندستان کے صوفیاء نے اس کو بڑے پیمانہ پر اختیار کیا۔ صوفیاء کی دعوتی کامیابی کا خاص سبب ان کی یہی پالیسی تھی۔

سوال

میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ کشمیر میں میں ایک سرکاری سروس کیلئے درخواست دی تھی۔ میں اس کے لئے کوالیفائڈ تھا مگر مجھ کو نہیں لیا گیا۔ اب یہاں کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ جب تک کشمیر کے سیاسی حالات نہیں بدلیں گے ہمارے ساتھ ناانصافی ہوتی رہے گی۔ ہم کو لڑ کر

اپنے حقوق لینا ہے۔ کشمیر سے غیر مسلم غلبہ کو ختم کرنا ہے۔ اسکے بعد ہی ہم کو اپنے حقوق مل سکتے ہیں۔
(ایک کشمیری نوجوان، اننت ناگ)

جواب

یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ آپ کے ساتھی جو کشمیر چاہتے ہیں وہ انہیں بروقت ہی ''آزاد کشمیر'' میں مل چکا ہے۔ پھر آزاد کشمیر کے ہزاروں مسلمان کیوں وہاں سے نکل کر برطانیہ اور امریکہ میں چلے گئے اور وہاں غیر مسلم سیاسی غلبہ کے تحت پرسکون طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔

اسی طرح آپ لوگ جو مسلم حکومت چاہتے ہیں وہ زیادہ بڑے پیمانہ پر پاکستان میں عملاً حاصل ہو چکی ہے۔ پھر پاکستان کے لاکھوں مسلمان کیوں امریکہ اور یورپ میں جا کر غیر مسلم حکومت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دہرے معیار کی اسی پالیسی نے اس پورے علاقہ کے مسلمانوں کو اللہ کی نظر میں بے قیمت بنا دیا ہے۔ اس قسم کی ڈبل پالیسی سے اس دنیا میں کسی کو ذلت تو مل سکتی ہے مگر اسکو عزت نہیں ملے گی۔ جہاں تک آپکے ذاتی مسئلہ کا تعلق ہے تو اس قسم کی وقتی ناکامی موجودہ دنیا میں فطرت کے قانون کے تحت ہوتی ہے نہ کہ کسی کے تعصب کے تحت۔ اس دنیا میں ہر ایک کے ساتھ اور ہر ملک میں ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہر گوند کھورانہ کو لیاقت کے باوجود دہلی یونیورسٹی میں سروس نہیں ملی۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ناموافق حالات سے مایوس نہ ہو اور بہتر مستقبل کی طرف اپنا حوصلہ مندانہ سفر جاری رکھے۔ اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

جہاں تک لڑ کر حقوق لینے کی بات ہے وہ سراسر بے معنیٰ ہے۔ حقائق کی اس دنیا میں کسی کو بھی لڑ کر اپنے حقوق نہیں ملتے۔ اس دنیا میں جب بھی کسی کو اسکے حقوق ملتے ہیں تو وہ پر امن تعمیری جدوجہد کے ذریعہ ملتے ہیں۔ پاکستان میں مہاجرین نے لڑ کر اپنے حقوق لینا چاہے مگر آخر میں انہیں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

سوال

الرسالہ ماہ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ایک خط کے جواب میں حدیث ترمذی اور ابن ماجہ 'کتاب الذہد' کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ زمین میں چار انگل جگہ بھی نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے اللہ کے لئے سجدہ کی حالت میں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں زمین پر انسانوں کی رہائش گاہیں بھی ہیں، گندگی کے اسباب بھی ہیں۔ اس حالت میں فرشتے کس شکل میں اپنی پیشانی سجدہ کی حالت میں اللہ کے لئے رکھے ہوئے ہیں؟ تفصیل سے مستفید فرمائیں۔

(ابرار حسین قریشی، دھار، مدھیہ پردیش)

جواب

اس حدیث میں ''سجدہ'' لفظی معنوں میں نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک تعبیر ہے۔ حدیث کا مدعا یہ ہے کہ ساری دنیا میں اللہ کے فرشتے کثرت سے موجود ہیں اور ہر لمحہ اللہ کی اطاعت میں سرگرم رہتے ہیں۔ اس حدیث کو پڑھ کر آدمی کو چاہیئے کہ وہ خود اپنے بارے میں سوچے، نہ کہ فرشتوں کے بارے میں۔ وہ فرشتوں کے ''سجدہ'' سے زیادہ خود اپنے سجدے کے لئے فکر مند ہو جائے۔

سوال

آپ عالم دین ہیں۔ آپ کو ہر سوال کا جواب دینا چاہیئے۔ اگر جواب نہیں دیتے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ نے اس شخص کو اسلام کی باتیں نہیں بتائیں جو آپ سے سوال کر کے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ قیامت کے دن کیا میں خدا سے عرض نہیں کروں گا کہ مجھے علم نہیں تھا اور میں نے ان سے علم مانگا۔ مگر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ (شاہ عمران حسن، دلاور پور، مونگیر، بہار)

جواب

علم کے حصول کا ذریعہ سوال و جواب نہیں ہے۔ بلکہ مطالعہ ہے یا اہل علم کی صحبت میں بیٹھنا۔ جو بات ذہن میں آجائے، اس کو سوال بنانا اور اس پر لمبے لمبے خطوط لکھنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی اسلام کا طریقہ نہیں کہ کوئی شخص اس قسم کا ایک مضمون استفتاء کے لئے بنائے کہ الرسالہ کو پڑھنا جائز ہے یا ناجائز اور پھر مفتی صاحبان

اس پر ''الجواب صحیح'' کی مہر کے ساتھ تفصیلی جواب دینا شروع کر دیں۔ اس قسم کا سوال پوچھنا بھی اسلامی روح کے خلاف ہے اور اس کا جواب دینا بھی اسلامی روح کے خلاف۔ چنانچہ ایک صحابی کہتے ہیں: **وکان ینھی عن قیل وقال کثرۃ السوال** (صحیح البخاری، کتاب الرقاق)

سوال

کامیاب ازدواجی زندگی میں صرف بہو کو نقطۂ نظر بنایا جاتا ہے۔ یہاں چھ گھر ساس بہو کا ہے۔ میں نے کچھ الگ دیکھا۔ ایسا کیوں ہے کہ گھر کے سارے جھگڑے کی وجہ بہو کو مانا جاتا ہے۔ کیا سسرال میں بہو کو داعی کی طرح رہنا چاہیئے جو یک طرفہ ناخوش گواریوں کو برداشت کرے۔ (صوفیا حیدر، بتیا، بہار)

جواب

شرعی اعتبار سے ساس اور بہو دونوں کی ذمہ داری بالکل یکساں ہے۔ ساس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بہو کو وہی عزت اور محبت دے جو وہ اپنی بیٹی کا حق سمجھتی ہے۔ اسی طرح بہو کا فرض ہے کہ وہ ساس کے ساتھ اسی عزت اور محبت کا معاملہ کرے جو وہ اپنی ماں کے لئے کرتی رہی ہے۔ اس معاملہ میں دونوں میں سے جو بھی کوتاہی کرے گا وہ یقینی طور پر اس کے لئے آخرت میں پکڑا جائے گا۔ دونوں میں سے کوئی بھی آخرت کی پکڑ سے بچنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر گھر کو امتحان کا مقام بنا دیا ہے۔ شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے لئے امتحان کا پرچہ ہیں۔ اسی طرح ساس اور بہو دونوں ایک دوسرے کے لئے امتحان کا پرچہ ہیں۔ یہ امتحان اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس میں کوتاہی کی تلافی نماز روزہ کے ذریعہ بھی نہیں ہو سکتی۔

سوال

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی تسبیح اور اس کا ذکر کر رہی ہیں۔ ہر چیز خدا کے ذکر میں مشغول ہے۔ یہاں دنیا میں ایسی بھی چیزیں ہیں جو گندگی کی حالت میں ہوتی ہیں تو کیا وہ بھی ذکر کر رہی ہیں؟۔ قرآن کی ان باتوں کا اصل مفہوم کیا ہے؟۔ براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔ (خورشید احمد کمار، شوپیان، کشمیر)

جواب

مذکورہ قسم کی قرآنی آیتوں میں جو ذکر بتایا گیا ہے اس سے مراد ذکر قولی نہیں ہے بلکہ ذکر حالی ہے۔یعنی ان کا وجود اللہ کی قدرت کو بیان کر رہا ہے۔مثلاً سورج ہم کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے۔ اس روشنی اور حرارت میں انسان کے لئے مفید پہلو بھی ہے اور مضر پہلو بھی۔مگر فطرت کے مخصوص نظام کے تحت انسان کو سورج کا صرف مفید پہلو پہنچتا ہے،اس کے مضر پہلو سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ یہی معاملہ دنیا کی دوسری تمام مادی چیزوں کا ہے۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو،مذہب اور جدید چیلنج)

جن چیزوں کو آپ گندی چیزیں کہہ رہے ہیں ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔مثلاً زمین پر جب بھی کہیں کوئی گندی چیز ظاہر ہوتی ہے،جیسے جانور کا بول و براز،تو فوراً ہی وہاں لاکھوں کی تعداد میں بیکٹیریا اور کیڑے جمع ہو جاتے ہیں جو ڈی کمپوز (de-compose) کر کے اسکو فضا میں تحلیل کر دیتے ہیں۔اگر فطرت کا یہ نظام نہ ہوتا تو موجودہ زمین پر انسان کیلئے زندگی گذارنا ناممکن ہو جائے۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کی چیزوں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کے لئے عبرت اور نصیحت بن سکیں۔اس دنیا کی ہر چیز خواہ وہ پھول ہو یا کانٹا،انسان کو کوئی نہ کوئی اعلیٰ پیغام دے رہی ہے۔مثلاً درخت یہ پیغام دے رہے ہیں کہ تم یکطرفہ طور پر،دوسرے انسانوں کے لئے نفع بخش بنو۔حتیٰ کہ ان چیزوں میں بھی گہرا سبق ہے جن کو آپ گندی چیز سمجھ رہے ہیں مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی نادانی سے گندگی کرے تو تم اس کو مزید بکھیرنے والے نہ بنو بلکہ پہلی فرصت میں اس کو صاف کرنے کی کوشش کرو۔تمہارا کام لوگوں کے عیب پر پردہ ڈالنا ہونا چاہیئے،نہ کہ اس کی تشہیر کر کے لوگوں کو بدنام کرنا۔

سوال

۱۔ آپ کے مشن سے مجھے پورا اتفاق ہے۔مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کو صالح بنانے سے پہلے غیر مسلموں کو کس طرح دعوت دی جائے؟۔قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

۲۔ الرسالہ اردو کا مطلب چند دن پہلے ایک صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا، یعنی سب سے اچھا رسالہ۔ مجھ کو تعجب اس بات پر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اچھا کہے وہی تو سب سے زیادہ برا ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ نے عالم ہونے کے باوجود اتنا فخر والا نام کس طرح رکھ لیا۔ اس کی وضاحت کریں۔ (شاہ عمران حسن، مونگیر، بہار)

جواب

پہلے سوال کا جواب الرسالہ میں شائع ہو چکا ہے۔ عرض یہ کہ غیر مسلموں کو دعوت دینی ہے وہ مسلمانوں کی صالحیت کی طرف نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف ہے۔ چنانچہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ دعوت وتبلیغ کے لئے مسلمانوں کا اصلاح یافتہ ہونا شرط نہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۸۵۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ الرسالہ کا مطلب سب سے اچھا رسالہ نہیں ہے۔ رسالہ کیلئے عربی زبان میں مجلّہ یا جریدہ کا لفظ آتا ہے۔ رسالہ کا معنی عربی زبان میں پیغام (message) کے ہیں۔ الرسالہ کا مطلب پیغام (The message) ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جن صاحب نے آپ سے مذکورہ بات کہی، ان کو بتائیے کہ اس طرح کی بات تنقید نہیں ہے بلکہ غلط الزام ہے۔ اسلام میں تنقید کرنا جائز ہے مگر غلط الزام لگانا یقینی طور پر اسلام میں جائز نہیں۔

سوال

اسلام چونکہ ایک دین فطرت ہے اور رب العزت نے اس کو انسان کی طبیعت کے عین مطابق بنایا ہے۔ یہ دین باقی ماندہ ادیان پر غالب ہے۔ آپ متشددانہ طرز عمل کے خلاف ہیں۔ ایسی حالت میں چوری کرنے والے یا شراب پینے والے کو شرعی سزا کیسے دی جائے گی؟۔ (محمد ادریس ٹاک، کشمیر، پن 1923303)

جواب

اسلام بلاشبہہ دین فطرت ہے۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے ادیان خلافِ فطرت تھے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ کا بھیجا ہوا ہر دین فطرت کے مطابق ہی تھا مگر بعد کی تحریفات نے اسکو بدل دیا۔ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب میں جو فرق ہے وہ افضل اور غیر افضل کا نہیں ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ پچھلے آسمانی مذاہب تبدیلیوں کی بنا پر غیر مستند ہو گئے۔ جبکہ اسلام آج بھی اپنی ابتدائی حالت پر باقی ہے۔

مجرم کو شرعی سزا دینا عوام کا کام نہیں۔ یہ ایک قائم شدہ حکومت کا کام ہے جو حالات پر کنٹرول رکھتی ہو۔ عوام کے لئے پُر من تبلیغ و اصلاح ہے نہ کہ شرعی قوانین کو طاقت کے ذریعہ نافذ کرنا۔

سوال

موجودہ زمانہ میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ ٹینشن (ذہنی تناؤ) میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس مسئلہ کو لے کر لوگ نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حال میں مجھے ایک تجربہ ہوا۔ ایک صاحب جو ٹینشن کی کیفیت میں مبتلا تھے وہ ایک نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ایک ہزار روپیہ خرچ کرنے کے بعد انہیں جو مشورہ ملا وہ یہ تھا کہ تم اپنے مذہب کے مطابق، عبادت کیا کرو۔ مریض نے کہا کہ میں تو پہلے ہی سے عبادت کرتا ہوں۔ اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ قرآن کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔ (نازش اعظمی، دہلی)

جواب

نفسیاتی ڈاکٹروں کی سوچ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ وہ مریض کو ایسی ترکیب بتائیں جو ٹینشن کو ختم کرنے والی ہو۔ میرے نزدیک یہ نظریہ بذاتِ خود غلط ہے۔ کیوں کہ ٹینشن خود نظام فطرت کی پیداوار ہے اور جو چیز نظام فطرت کی پیداوار ہو اس کو آپ بھی تدبیر سے ختم نہیں کر سکتے۔ جو چیز فطرت میں شامل ہو اس کو قبول کرنا مسئلہ کا حل ہے نہ کہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو کبد یا مشقت میں پیدا کیا ہے (البلد ۴) یہ ایک عام انسانی تجربہ ہے کہ زندگی مشقتوں سے خالی نہیں۔ علمی تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔ روسی ماہر نفسیات نمیلو (Nemilov) نے اپنی کتاب عورت کا المیہ (Biological Tragedy of Woman) میں بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ انسانی زندگی المیہ سے خالی ہو:

Human life is unthinkable without tragedies, without the tragic element. The more highly developed and nearer to perfection man is the greater are the possiblities for tragic conflicts. (pp. 13-15)

مشقت جب خود فطرت کے قانون کے مطابق، انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے تو ہمیں اس کو مان کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیئے نہ کہ اس کا انکار کر کے۔ برسات کے موسم میں جب بارش ہوتی ہے تو انسانی آبادیوں کے لئے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مگر کوئی شخص یہ نہیں سوچتا کہ وہ برسات کی بارش کو روکے۔ بلکہ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ بارش کے باوجود وہ کس طرح اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے۔

یہی طریقہ ہم کو ٹینشن (ذہنی تناؤ) کے مسئلہ کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔ ہم ٹینشن کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم ٹینشن کو بطور واقعہ مان لیں تو یقینی طور پر ہم اپنے آپ کو اس کا شکار ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ یہی اس مسئلہ کا فطری حل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹینشن سے خالی زندگی گذارنے کے لئے واحد کامیاب فارمولا یہ ہے کہ ٹینشن کو انسانی زندگی کے ایک لازمی حصہ کے طور پر قبول کر لیا جائے۔

The only successful formula for a tension free-life is to accept the tension as an essential part of human life.

سوال

واقعہ یہ ہے کہ میرا مسئلہ وہی ہے جو بہت سی مسلم لڑکیوں کا مسئلہ ہے اور وہ میری شادی کا مسئلہ ہے۔ میری ماں آج کل پریشانی میں ہیں ورنہ وہ خود آپ سے رابطہ قائم کرتیں۔ میرے رشتہ کیلئے بہت سے پیغامات آئے۔ ان میں سے کوئی رشتہ میرے والدین کو پسند نہ آسکا۔ میں اللہ پر بہت یقین رکھتی ہوں۔ مگر جب میں اپنے والدین کو پریشان دیکھتی ہوں تو اپنا اعتماد کھو دیتی ہوں۔ میری عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہوں اور میں نے کمپیوٹر کی ٹریننگ لی ہے۔ آج کل میں ایک اسلامک ویب سائٹ پر کام کر رہی ہوں۔ میری گذارش ہے کہ آپ مجھے کچھ دعا بتائیں اور مشورہ دیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر ایک کیلئے نکاح کا ایک مقرر وقت ہے۔ اللہ کی رحمت سے میں اپنے کام میں کامیاب ہوں۔ (ایک پاکستانی خاتون، انٹرنیٹ سے ترجمہ)

جواب

مذکورہ قسم کا مسئلہ بہت سی مسلم لڑکیوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں اصل غلطی والدین کی ہے۔ والدین عام طور پر اپنی بیٹی کیلئے ایک آئیڈیل لڑکے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ تلاش اکثر برعکس نتیجہ کا سبب بنتی ہے۔ والدین اپنے جذبۂ محبت کے تحت یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ دنیا میں نہ کوئی آئیڈیل لڑکا ہے اور نہ کوئی آئیڈیل لڑکی۔ ایسی حالت میں صحیح بات یہ ہے کہ آئیڈیل کو چھوڑ کر پریکٹکل کے اصول پر عمل کیا جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ شادی کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ والدین کو اپنی پسند کا لڑکا یا لڑکی مل جائے۔ شادی کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہوں اور حقائق کی بنیاد پر، نہ کہ جذبات کی بنیاد پر باہمی زندگی کی تعمیر کریں۔ ایسی حالت میں والدین کیلئے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زندگی کے عملی حقائق سے باخبر کریں۔ وہ انہیں تیار کریں کہ وہ شادی کے بعد تحمل اور دانش مندی کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں اور ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے زندگی کی جدوجہد کریں۔ اگر لڑکے اور لڑکی میں اس قسم کا شعور حیات موجود ہو تو یقینی طور پر وہ کامیاب زندگی حاصل کرلیں گے، خواہ شادی کے وقت بظاہر انکی معاشی حالت زیادہ بہتر نہ ہو۔

مذکورہ قسم کی صورت میں والدین کیلئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ لڑکی کی رضامندی لے کر اور اللہ کے بھروسہ پر بلاتاخیر نکاح کا معاملہ کردیں۔ کامیاب زندگی کے معاملہ میں وہ اللہ پر بھروسہ کریں، نہ کہ اپنی سوچ اور تدبیر پر۔

سوال

نیشنل اور انٹرنیشنل مسائل میں آپ کا مثبت اپروچ درست ہے۔ ہم کو خوشی ہے کہ آپ جیسا ایک آدمی انڈیا میں موجود ہے بلکہ یہ پورے ایشیا کیلئے خوشی کی بات ہے۔ میرا شبہہ اور اندیشہ صرف یہ ہے کہ کیا مسلمان آنے والے زمانہ میں ہندستان میں پر امن طور پر رہ سکتے ہیں؟۔

(عدنان کریمی، 4 /16-8-131 کالاڈیرہ، مالک پٹ، حیدرآباد ۲۴)

جواب

مسلمان اس ملک میں تعمیری سوچ اور امن پسندی کے ساتھ رہیں گے یا نہیں، یہ اب مستقبل کا سوال نہیں۔ اس کا جواب خود حال کے اندر مل چکا ہے۔ اللہ کے فضل سے ہماری کوششوں کے نتیجہ میں اب یہاں کے مسلمان بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ وہ اعراض کا طریقہ اختیار کر چکے ہیں جس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فساد تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ وہ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنے کا فارمولا عملاً اپنا چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شہر اور بستی کے مسلمان تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ وہ باہر دیکھنے کا مزاج ترک کر کے وطنی مزاج کے تحت جینا سیکھ گئے ہیں، جس کے نتیجہ میں یہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دن بدن بہتر ہو رہے ہیں۔ وہ احتجاج غیر کا طریقہ چھوڑ کر تعمیر خویش کے اصول کو اختیار کر چکے ہیں، جس کا مثبت نمونہ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں لوگ اخبار اور میڈیا کے ذریعہ اپنی رائے بناتے ہیں اور میڈیا اپنے مخصوص مزاج کے تحت زیادہ تر منفی واقعات کو لیتا ہے، وہ مثبت واقعات کو رپورٹ نہیں کرتا۔ اس لئے اس ہونے والے واقعہ سے لوگ ابھی پوری طرح باخبر نہیں۔ مگر جلد وہ وقت آئے گا جب کہ یہ واقعہ اتنا نمایاں ہو چکا ہوگا کہ لوگ اخباروں میں چھپے بغیر اس کو جانیں گے اور ٹی وی اسکرین پر دکھائے بغیر اس کو دیکھیں گے۔

سوال

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں مسلم عوام میں بہت کم واقفیت ہے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟۔ مسلمان کے لئے اس پر عمل کرنا واجب ہے یا فرض ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کا اطلاق کس طرح سے کیا جا سکتا ہے؟۔ مہربانی کر کے الرسالہ میں اس کو بتائیں۔

محجوب کے بارے میں بھی معلومات صحیح نہیں ہیں۔ آپس میں اس کو لے کر غلط فہمیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ناانصافی بھی ہو رہی ہے۔ عوام میں اس کو لے کر الجھن وتشویش ہے۔ اس ضمن میں بھی گزارش ہے کہ آپ ایک مضمون ضرور لکھیں۔ قرآن میں اس کا ذکر لوگ نہیں بتاتے لیکن کچھ علماء

نے اس کو صحیح بتایا ہے۔ کچھ نے اختلاف بھی کیا ہے (مہدی حسن، وارانسی)

جواب

مذکورہ دونوں مسئلہ کے بارے میں الرسالہ میں مضامین آچکے ہیں۔ دوسرے علماء نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس معاملہ میں اصل مسئلہ واقفیت کا نہیں ہے بلکہ عمل کے جذبہ کا ہے۔ موجودہ مسلمانوں میں عمل کا جذبہ نہیں، اس لئے وہ مسئلہ پیدا ہوا جس کا آپ نے ذکر کیا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق حکومت سے نہیں ہے بلکہ اسکا تعلق افراد سے ہے۔ اسکی اصل یہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا مددگار بننا چاہتا ہو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو انصاف اور دیانت کی روش پر دیکھنا چاہے۔ اسی جذبہ کی مخلصانہ تعمیل کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ایک دوسرے کیلئے خیر خواہی نہیں، اس لئے ان کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل بھی جاری نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کے لئے سچی خیر خواہی موجود ہو تو خود فطرت کے زور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل جاری ہو جائے، خواہ اس کے شرعی مسائل لوگوں کو بتائے گئے ہوں یا نہ بتائے گئے ہوں۔

محجوب پوتے کی وراثت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محجوب پوتے کو وراثت نہ دی جائے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محجوبیت کی بنا پر بظاہر جو وراثتی لنک ٹوٹ رہی ہے اسکو وصیت کے ذریعہ پورا کر دیا جائے۔ اگر کسی خاندان میں آپ ایسا نہ دیکھیں تو اس کا سبب شرعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کی سرکشی ہے، مثلاً بہن کا حق شرعی طور پر معلوم اور مسلّم ہے مگر بہت کم مسلمان ہیں جو بہن کو اسکا باقاعدہ شرعی حق دیتے ہوں۔

سوال

مجھے صوفی سنتوں کے جیون چرتر پڑھنے کا شوق ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شیخ فریدالدین عطّار رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب تذکرۃ الاولیاء کا اردو میں ترجمہ جناب مولانا قاری محمد عادل خان صاحب کا پڑھا۔ اس کتاب میں حضرت ذوالنون مصریؒ کے حالات ومناقب میں آپ کا ایک ارشاد ہے۔ ''قلیل

کھانا جسمانی توانائی کا ذریعہ ہے اور قلیل گناہ روحانی توانائی کا ذریعہ'' (p.79)

اس ارشاد میں ''قلیل کھانا جسمانی توانائی کا ذریعہ ہے'' تو سمجھ میں آ گیا لیکن ''قلیل گناہ روحانی توانائی کا ذریعہ ہے'' سمجھ میں نہیں آیا۔ براہ کرم اس پر روشنی ڈالنے کی مہربانی فرمائیں۔ (رام دیو، جی ایچ ۲۷۹/۴، پچھتم وہار، نئی دہلی، ۱۱۰۰۶۳)

جواب

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس ملفوظ میں قلیل گناہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں لمم کہا گیا ہے (النجم ۳۲) اس سے مراد گناہ کرنا نہیں ہے بلکہ گناہ ہو جانا ہے۔ گناہ کبیرہ سرکشی کے تحت ہوتا ہے اور گناہ صغیرہ بشری تقاضہ کے تحت۔ جو آدمی گناہ کبیرہ سے بچنے کا اہتمام کرے اور بشری تقاضہ کے تحت اتفاقاً کبھی گناہ صغیرہ کا مرتکب ہو جائے تو ایسا شخص قابل معافی ہے، نیز توبہ اور احساس گناہ کی صورت میں وہ انسان کی روحانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

سوال

میں سوامی ویویکانند کا پیرو ہوں۔ میں ان کی کتاب آپ کو بھیج رہا ہوں۔ سوامی جی کا کہنا ہے کہ تمام مذاہب ایک ہی سچائی کی طرف جانے کے الگ الگ راستے ہیں۔ چاہے وہ ہندوازم ہو یا مسیحیت ہو یا اسلام ہو یا سکھ ازم ہو یا یہودیت ہو۔ میرے نزدیک اسی کا پرچار کیا جانا چاہیئے تاکہ لوگوں کے اندر ایکتا پیدا ہو۔ (ڈی این ملہوترا، دلشاد گارڈن، دہلی)

جواب

وحدتِ ادیان کے اس تصور سے مجھے اتفاق نہیں۔ سچائی کبھی متعدد نہیں ہو سکتی۔ سچائی اگر ایک نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ وحدتِ ادیان کے اس نظریہ کے حق میں کوئی بھی منطقی دلیل موجود نہیں۔ یہ پورا نظریہ صرف تمثیلات کے اوپر قائم ہے اور تمثیل سے کبھی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

Anology is the weakest form of Argument.

سچائی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ آدمی کو یقین عطا کرے۔ دنیا میں جینے کے لئے آدمی کو یقین کا

سرمایہ درکار ہے اور سچائی آدمی کو یہی یقین دیتی ہے۔ ''میں نے سچائی کو پالیا'' یہ یقین صرف کسی ایک چیز پر قائم ہوسکتا ہے، نہ کہ متعدد چیزوں پر۔

انسانی سماج میں ایکتا بلاشبہہ ضروری ہے۔ مگر یہ ایکتا ''میں بھی سچا تم بھی سچے'' جیسے مصنوعی نظریے پر قائم نہیں ہوسکتی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ یہ ہے کہ اخلاقی تقاضہ کے تحت ہر ایک دوسرے کو قابلِ عزت سمجھے۔ میرے نزدیک مذہبی اتحاد کا درست فارمولا یہ ہے.....ایک کی پیروی کرو اور ہر ایک کی عزت کرو:

Follow one, and respect all.

سوال

کیا دماغی صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں یا کسبی؟۔ انسانی دماغ محدود ہے یا غیر محدود۔ کیا ایک انسان تمام علوم کو اپنے ذہن میں سمیٹ سکتا ہے۔ انسانی دماغ اصلاً ہے کیا؟۔ برائے مہربانی آپ اپنے مطالعہ کی روشنی میں انسانی دماغ کی کارکردگی اور صلاحیتوں کے بارے میں ہم کو مطلع فرمائیں۔

(محمد مجاہدالدین، سکندرآباد)

جواب

انسانی دماغ ابھی تک ایک پُراسرار حقیقت ہے۔ پانچ ہزار سال کی تحقیق کے باوجود ابھی تک انسانی دماغ کے بارے میں بہت کم معلوم کیا جاسکا ہے۔ میرے تجربہ اور مطالعہ کے مطابق، انسانی دماغ لامحدود صلاحیت کا خزانہ ہے۔ یہ دماغی صلاحیت ہر انسان کو تقریباً یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔ مگر تحقیق بتاتی ہے کہ انسانی دماغ اپنی ابتدائی حالت میں ایک خوابیدہ صلاحیت کی مانند ہے۔ علم اور تجربہ اس صلاحیت کو بیدار کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کا نظریہ بتاتا ہے کہ دماغی صلاحیت کو جگانے میں سب سے زیادہ دخل اس چیز کا ہے جس کو ذہنی جھٹکا کہا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ آدمی کی شخصیت کچل کر رہ جائے۔

تاہم میرے تجربہ کے مطابق، ذہنی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر

اعتراف کا مادہ ہو۔ وہ حقیقتوں کو کھلے ذہن کے ساتھ دیکھے اور بغیر کسی تحفظ کے اس کو قبول کر لے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اعلیٰ ذہنی ترقی کے مرتبہ پر پہنچتے ہوں۔ میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہ کہ لوگ عام طور پر بند ذہن کے ساتھ جیتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اپنے مانوس تصورات کے سوا کسی اور تصور کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ اس کو اختیار کر پاتے ہیں

سوال

ہم نے بار بار پڑھا اور سنا ہے کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ اب عملی زندگی میں دیکھا جائے کہ ہم رشوت نہ لیں یہ تو ہمارے بس کی بات ہے مگر رشوت نہ دیں تو ہمارا جینا مشکل ہو جائے گا۔ ہمارے گھروں میں بجلی اور پانی نہیں آئے گا۔

اب اگر رشوت دیتے ہیں تو خدا کے ڈر سے دل کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آپ اس سوال کا جواب تفصیل سے دیں تا کہ میرے علاوہ بہت سے لوگوں کو جانکاری ملے۔ ایسے سماج میں آخر آدمی کیسے جیے گا؟۔ (بشیر احمد کالو، کشمیر)

جواب

آپ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے وہ مختلف کتب حدیث میں آئی ہے۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي (مسند احمد، جلد ۲، صفحہ ۱۶۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: الراشي والمرتشي كلاهما في النار (رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں آگ میں جائیں گے)

رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے کا حکم اس وقت یکساں ہے جب کہ رشوت دینے والا ایک ایسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دے جو شرعی اعتبار سے اس کا حق نہیں۔ اسی طرح رشوت لینے والا جو اپنی خدمت کے لئے حکومت سے تنخواہ پانے کے باوجود مزید رشوت کا طالب ہو وہ بھی اس حدیث کا مصداق ہے۔

لیکن اگر کہیں ایسا ہو کہ وقت کا نظام اس طرح بگڑ جائے کہ آدمی اپنا جائز حق بھی رشوت دیئے بغیر نہ پا سکے تو ایسی حالت میں اضطرار کا اصول منطبق ہوگا اور اپنا واقعی حق لینے کے لئے اس کا دینا جائز قرار پائے گا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا بدعت کی یہ تقسیم درست ہے اور اگر درست ہے تو ان دونوں قسموں کے درمیان کیا فرق ہے؟۔ تفصیل سے مستفید فرمائیں۔ (ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

عام طور پر بدعت کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ: کل ما احدث فی الدین فھو بدعۃ (نئی ہر چیز جو دین میں نکالی جائے وہ بدعت ہے) مگر یہ تعریف پوری طرح واضح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدعت (innovation) زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ زندگی میں بار بار نیا پن لانا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا مسلسل سفر ممکن نہیں ہوتا۔

تاہم نئی چیز کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ خود دین خدا میں کوئی نئی چیز نکالنا جس کا ثبوت قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔ مثلاً ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کرنا۔ یہ طریقہ قرآن وسنت سے ثابت نہیں۔ اس لئے اس کو غیر مطلوب قرار دیا جائے گا۔

بدعت یا نئی چیز کی دوسری صورت وہ ہے جو زمانہ کی ضرورت یا حالات کی تبدیلی کی بنا پر اختیار کی جائے مثلاً قرآن میں اعدادِ قوت (الانفال ۶۰) کا حکم آیا ہے۔ اس کی تشریح حدیث میں رمی سے کی گئی ہے۔ یعنی تیر مارنا۔ مگر موجودہ زمانہ میں تمام مسلم ملکوں میں اعدادِ قوت کو جدید اسلحہ کی فراہمی کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے نہ کہ تیر کمان کی فراہمی کے معنیٰ میں۔ یہ بظاہر ایک نئی چیز ہے مگر وہ مطلوب بدعت ہے، نہ کہ غیر مطلوب بدعت۔ اس فرق کو دوسرے لفظوں میں عبادتی بدعت اور معاملاتی بدعت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سوال

میں نے آپ کی کچھ تحریریں پڑھی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ اکثر صلح حدیبیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ صلح حدیبیہ تو قدیم زمانہ میں ایک خاص وقت کے لحاظ سے تھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کیلئے اسکی مناسبت (relevance) کیا ہے؟۔ اسکی وضاحت فرمائیں۔ (خالد انصاری، نئی دہلی)

جواب

صلح حدیبیہ کوئی منفرد تاریخی واقعہ نہیں۔ وہ فطرت کا ایک عام اصول ہے۔ اس کا تعلق ہر زمانہ سے ہے۔ وہ فرد کی زندگی کے لئے بھی کارآمد ہے اور قوم کی زندگی کے لئے بھی۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اکثر دو فریقوں کے درمیان نزاع قائم ہو جاتی ہے۔ یہ نزاع بظاہر کسی حق یا کسی انصاف کے لئے ہوتی ہے۔ مگر زندگی کا قانون یہ ہے کہ آپ اپنا حق فریق ثانی سے نہیں لے سکتے۔ آپ کا مطلوب حق خود آپ کے تعمیری عمل کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ فریق ثانی سے ملا ہوا عطیہ۔ حدیبیہ پرنسپل یہ بتاتا ہے کہ جب کسی سے نزاع قائم ہو جائے تو نزاع کو حق یا انصاف کا سوال نہ بناؤ بلکہ اس کو امن کا سوال بناؤ۔ یعنی ہر قیمت پر جلد سے جلد نزاع کو ختم کر دو۔ نزاع کو ختم کرنے کا مطلب حالات کو نارمل بنانا ہے۔ نزاع کے وقت یہ ہوتا ہے کہ آپ کی ساری طاقت فریق ثانی سے لڑنے میں ضائع ہونے لگتی ہے۔ عین اسی وقت آپ کے لئے مواقع کار موجود ہوتے ہیں۔ مگر آپ ان مواقع کو استعمال نہیں کر پاتے۔ جب کہ کامیابی ہمیشہ مواقع کو استعمال کرنے سے ملتی ہے، نہ کہ حقوق کی لڑائی لڑنے سے۔

حدیبیہ پرنسپل ایک ابدی پرنسپل ہے۔ یہ ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔ اس تدبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ... ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے نارمل حالات پیدا کرو، تاکہ تمہیں موجودہ امکانات کو استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔

نزاع کو غیر مشروط طور پر ختم کرنا بظاہر نقصان کا ایک معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر نقصان کوئی مطلق چیز نہیں، نقصان ایک تقابلی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزاع کو باقی رکھنے میں بھی نقصان ہے اور نزاع کو ختم کرنے میں بھی نقصان۔ آپ کو یہ کرنا چاہیئے کہ دونوں قسم کے نقصان کے درمیان

موازنہ کریں۔ اگر آپ اس طرح موازنہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نزاع کو باقی رکھنے میں زیادہ نقصان ہے اور نزاع کو ختم کرنے میں کم نقصان۔ ایسی حالت میں حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا گویا زیادہ نقصان کے مقابلہ میں کم نقصان کو اختیار کرنا ہے اور بلاشبہہ دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ زیادہ نقصان والی صورت کو چھوڑ دیا جائے اور کم نقصان والی صورت کو اختیار کرلیا جائے۔

مزید یہ کہ حدیبیہ اصول پر نزاع کو ختم کرنے والے لوگ اگر دانش مند ہوں تو یہ تدبیران کے لئے اس سے بھی زیادہ بڑے فائدہ کا باعث بن سکتی ہے اور وہ ہے وقتی نقصان کو گوارا کر کے مستقبل کے عظیم تر فائدہ کو محفوظ کر لینا۔

سوال

اسلام کے مطابق، جنت اس کو ملے گی جو خدا کی شریعت پر عمل کرتا ہو۔ مگر یہ نظریہ ایک محدود نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ جو خدا کی شریعت کی بات نہیں کرتے مگر وہ ایک با اخلاق زندگی گزارتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے، وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، وہ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں، وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ آخر وہ خدا کی جنت سے محروم کیوں رہیں گے؟۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ (رجت ملہوترا، نئی دہلی)

جواب

یہ صحیح ہے کہ غیر خدا ترس لوگوں میں بھی بظاہر کچھ اخلاقی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ صحیح معنوں میں اخلاق نہیں ہوتا۔ زیادہ درست طور پر اسکو سماجی برتاؤ (social manners) کہا جاسکتا ہے۔ کوئی آدمی اس قسم کی اخلاقی روش اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ سماج میں اس کو اچھا سمجھا جائے۔ یہ خود پرستی کی ایک صورت ہوتی ہے، نہ کہ حقیقتاً خدا پرستی کی صورت۔

اس سماجی اخلاق کی اصلیت اس وقت کھل جاتی ہے جب کہ کوئی حقیقی جانچ کا موقع آجائے، جب آدمی کو اپنا کوئی بڑا مفاد خطرہ میں جاتا ہوا نظر آئے، جب کسی اخلاقی تقاضہ کو پورا کرنے کیلئے اس کو اپنی انا کو قربان کر دینا پڑے۔ اس قسم کا اخلاق ذاتی انٹرسٹ کے تابع ہوتا ہے، وہ مستقل اصول

کے تابع نہیں ہوتا۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ اچھے لوگ بھی اس وقت بدل گئے جب کہ انہیں کسی کڑی اخلاقی جانچ سے گذرنا پڑا۔ ایسے موقع پر یہ بظاہر بااخلاق لوگ اچانک بے اخلاق بن جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سے ڈرنے والا انسان ہی ہر حال میں اخلاقی اصول پر قائم رہ سکتا ہے۔ خدا کے سامنے حساب دینے کا اندیشہ خود انٹرسٹ کے تصور کو بدل دیتا ہے۔ اب انسان کا انٹرسٹ یہ بن جاتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے اچھا انسان ٹھہرے، نہ یہ کہ دنیا کی زندگی میں وہ لوگوں کو ایک اچھا انسان دکھائی دے۔

سوال

خدا کے وجود کو ماننا بظاہر ایک معقول بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک سوال یہ ہے کہ اگر اس دنیا کا خدا ہے تو یہاں اتنی زیادہ مصیبتیں (sufferings) کیوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے انسان طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر خدا ہی خالق ہے اور وہ خیر مطلق کی حیثیت رکھتا ہے تو دنیا میں پائی جانے والی مصیبتوں کی توجیہ کیا ہوگی؟۔ (پریا ملک، نئی دہلی)

جواب

یہ سوال بہت پرانا ہے۔ فلاسفہ اس کو برائی یا خرابی کا مسئلہ (problem of evil) کہتے ہیں۔ جو لوگ خدا کے وجود کو نہیں مانتے ان کا خیال یہ ہے کہ ان کے نظریہ کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو سطحی مطالعہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، اسکی کوئی گہری بنیاد نہیں۔

اس سوال کو وسیع تر تناظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہماری دنیا کے دو حصے ہیں۔ ایک انسانی دنیا جو مجموعی دنیا کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ دوسرے وسیع خلا میں پھیلی ہوئی کائنات، یہ بقیہ کائنات اتنی زیادہ وسیع ہے کہ انسانی دنیا کمیت کے اعتبار سے اس کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں رکھتی۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں دنیائیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وسیع کائنات کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آخری حد تک ایک معیاری کائنات ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی کوئی خرابی یا نقص

نہیں۔ مثال کے طور پر سورج کے گرد زمین کی گردش کو دیکھئے۔ یہ گردش بیک وقت دو انداز سے جاری ہے۔ ایک خود اپنے محور (axis) پر اور دوسرے سورج کے گرد بیضوی شکل میں اپنے مدار (orbit) پر۔

زمین کی یہ دوطرفہ گردش اتنی زیادہ صحت کے ساتھ مسلسل ہو رہی ہے کہ کروڑوں سال کے اندر بھی اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ زمین گویا ایک بہت بڑا ہوائی جہاز ہے جو دوطرفہ اصول پر مسلسل گردش میں ہے۔ مگر ہم نہایت سکون کے ساتھ اس کے اوپر زندگی گذار رہے ہیں اگر ہوائی جہاز کی مانند اس میں شور اور جنبش ہونے لگے تو زمین کے اوپر ہمارا رہنا محال ہو جائے۔

کچھ انتہا پسند منکرین خدا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادی دنیا نقص سے خالی نہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک زمین کی کشش غیر متناسب طور پر زیادہ ہے۔ اس کی وجہ سے چند کلو کے وزن کی چیز ہاتھ میں لے کر چلنا بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ نقص کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ توازن کا مسئلہ ہے۔ زمین میں کشش اگر کم ہو جائے تو بے شمار ناقابلِ حل مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ مثلاً انسان کا زمین پر ہموار انداز میں چلنا ممکن نہ رہے گا، زمین پر مکانات کھڑے کرنا سخت دشوار ہو جائے گا وغیرہ۔

مادی کائنات انسان کے مقابلہ میں ناقابلِ قیاس حد تک بڑی ہے۔ اسکے مقابلہ میں انسانی دنیا اتنی زیادہ چھوٹی ہے کہ بقیہ کائنات سے اسکو کوئی نسبت نہیں۔ اب جبکہ ایسا ہے کہ خرابی کا مسئلہ صرف انسان کی محدود دنیا کے ایک چھوٹے سے حصہ میں ہے اور وسیع کائنات خرابی سے مکمل طور پر پاک ہے تو یہ ماننا ہوگا کہ خرابی کا مسئلہ عموم میں استثناء کا مسئلہ ہے اور جب ایسا ہے تو استثناء کی توجیہہ عموم کی روشنی میں کی جائے گی نہ کہ عموم کی توجیہہ استثناء کی روشنی میں کی جانے لگے۔

اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی میں خرابی کا مسئلہ آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر پیدا ہوا ہے نہ کہ تخلیق میں کسی نقص کی بنا پر۔ اگر وہ تخلیق میں نقص کی بنا پر ہوتا تو اس کی مثالیں وسیع کائنات میں ہر طرف موجود ہوتیں، نہ کہ وسیع کائنات کے صرف ایک بے حد چھوٹے حصہ میں۔

اصل یہ ہے کہ خالق نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق، وسیع کائنات کو جبری نظام

(determinism) کے تحت براہِ راست اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔ اس لئے وہ کسی تبدیلی کے بغیر ایک مقرر حالت پر قائم رہتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو امتحان کی مصلحت کے تحت آزادی دی گئی ہے۔ اسی فرق نے مزکورہ بالا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ انسان اپنی آزادی کا بار بار غلط استعمال کرتا ہے۔ اسی غلط استعمال نے وہ مسائل پیدا کئے ہیں جن کو خرابی کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ انسان اگر اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کرے تو انسانی دنیا بھی اسی طرح بے نقص دنیا بن جائے گی جس طرح بقیہ کائنات بے نقص دنیا بنی ہوئی ہے۔

سوال

ایک صاحب نے لاہور کے ماہنامہ اشراق کے شمارہ ستمبر ۲۰۰۱ میں شائع شدہ مضمون (مولانا وحید الدین کا اسلوب تنقید) کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس شائع شدہ مضمون کا ایک حصہ یہ ہے:

''آج اس خطے کا کون سا مسلمان ایسا ہے جو شاہ ولی اللہ، شیخ احمد سرہندی، سید احمد شہید، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، علامہ محمد اقبال، مولانا مودودی، ٹیپو سلطان، محمد علی جناح جیسی تمام شخصیات یا ان میں سے بہت سے لوگوں سے تعلق خاطر نہیں رکھتا یا ان کی فکر اور اخلاص کا مداح نہیں ہے؟ جب آپ ان سب پر ایسے اسلوب میں تنقید کریں گے جن سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے تو پھر یہ لوگ آپ کے مخاطب کیسے بن سکتے ہیں؟۔

یہ واقعہ ہے کہ مولانا وحید الدین نے اپنے تنقیدی اسلوب کی بنا پر مسلمانوں کے قریباً تمام قابل ذکر طبقات میں اپنے لئے ایک ناپسندیدہ فضا پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ انکے قلم سے نکلنے والی بہت سی مثبت اور قابل قدر باتیں بھی ان حلقوں میں نہیں پہنچ پاتیں اور یوں خود مولانا وحید الدین کا اپنا اسلوب تحریر انکی دعوت کے فروغ کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ اگر ہم مولانا وحید الدین کی ایسی تحریروں کے اقتباسات نقل کریں تو یہ مضمون غیر معمولی طور پر طویل ہو جائے گا.....صرف ایک اقتباس یہاں درج کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا قلم زور تنقید کے کیا نمونے پیش کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے یزید بن معاویہ کے عہد میں جو طرز عمل اختیار کیا، وہ مولانا کے تصور

دین کے مطابق، چونکہ درست نہیں تھا، اسلئے دیکھیے کہ وہ ان کا اور ان کی والدہ کا ذکر کیسے کرتے ہیں:

''میں اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے ایک سے زیادہ ایسے افراد کو جانتا ہوں جو کم عمری میں ماں کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری زندگی بربادی کا نشان بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں کے روپ میں عورت کا رول انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ عبداللہ بن زبیر کی ماں (اسما) نے ان کو ایک بڑے اقدام پر ابھارا۔ چنانچہ ایک شخص جو اقدام کا ارادہ چھوڑ چکا تھا، وہ دوبارہ اقدام کے لئے آمادہ ہوگیا۔ شہنشاہِ اکبر کی ماں (مریم مکانی) نے اکبر کو ملا عبدالنبی کے خلاف کاروائی سے روکا۔ چنانچہ اکبر ان کے خلاف سخت کاروائی سے باز رہا، وغیرہ وغیرہ۔

راقم الحروف اگر بچپن میں ماں سے محروم ہوجاتا یا اگر مجھ کو ایسی ماں ملتی جو مجھے اپنے ''دشمنوں'' کے خلاف لڑنے جھگڑنے پر اُکساتی رہتی تو یقینی طور پر میری زندگی کا رخ دوسرا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے انجام سے بچایا اور مجھ کو اپنی ایک صداقت کے اظہار کا ذریعہ بنایا''۔

مولانا وحیدالدین کے نزدیک صحابہ پر تنقید کرنا جائز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عنداللہ ابن زبیر پر تنقید نہیں؟ کیا یہ حضرت اسما بنت ابی بکر پر تنقید نہیں.....؟ ہم اس بات سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ مولانا وحیدالدین خاں کی رائے میں صحت کا امکان کتنا ہے، ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت اسما کا ذکر اس اسلوب میں اور اس تقابل کے ساتھ، کیا تنقید کا کوئی قابل تحسین اسلوب ہے؟'' (ایک قاری الرسالہ، لاہور)

جواب

پاکستانی ماہنامہ کے مذکورہ مضمون میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلاشبہہ غیر علمی بھی ہے اور غیر ذمہ دارانہ بھی۔ یہ اعتراض راقم الحروف کی کتاب (خاتونِ اسلام) کے ایک باب سے لیا گیا ہے۔ کوئی بھی شخص اس باب کو غیر جانبدارانہ انداز سے پڑھے تو یقیناً وہ جان لے گا کہ اس باب کا موضوع صحابہ یا صحابیہ کی روش پر تبصرہ نہیں ہے جس کی ایک مثال ''خلافت وملوکیت'' نامی کتاب ہے۔ میری کتاب کا موضوع اسکے برعکس صرف ایک مغربی پروپیگنڈہ کا جواب ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہ بتانے کی

کوشش کی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے خانہ نشین عورت بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے۔ جس کو مغربی لوگ صرف غیر خانہ عورتوں کیلئے ممکن سمجھتے ہیں۔ اس نکتہ کو ثابت کرنے کیلئے میں نے کتاب میں تین خواتین کی مثالیں دی ہیں ___ حضرت اسماء، مریم زمانی، زیب النساء۔

میری کتاب کی مذکورہ عبارت میں نعوذ باللہ کسی صحابی یا صحابیہ پر تنقید ہرگز نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ اس میں سادہ طور پر تین خواتین کا، خاتون کی حیثیت سے رول بتایا گیا ہے۔ عبارت کے مدعا کے مطابق، اس مثال میں مذکورہ خاتون کا صحابیہ ہونا ایک اتفاقی امر ہے۔

بلاغت کا مسلّم اصول ہے کہ تمثیل کے طریقہ میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ پیش نظر مثال کا متعلق پہلو ہی مقصود ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر پہلو وہاں غیر متعلق قرار پاتے ہیں۔

In employing the method of anology, it should always be possible to show that the resemblances noted bear relevance on the point to be established whereas the differences are irrelevant.(1/337)

مذکورہ تنقید میں دو واضح غلطیاں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ناقد نے اس علمی نکتہ کو ملحوظ نہیں رکھا کہ اس مثال میں حضرت اسماء کا نام صحابیہ کی حیثیت سے مراد نہیں ہے بلکہ دوسری دو خواتین کی طرح، ان کا نام بھی یہاں ایک خانہ نشین خاتون کی حیثیت سے مراد ہے۔ دوسری بات یہ کہ میری کتاب میں ان خواتین کا نام تنقید کے مقصد سے نہیں لایا گیا ہے بلکہ ان کے تعریفی کارنامہ کی حیثیت سے لایا گیا ہے۔ مذکورہ ناقد نے اپنے ایک ذہنی تخیل کو شامل کر کے غیر ضروری طور پر اس کو قابل اعتراض بنانے کی کوشش کی ہے اور اسطرح انہوں نے ایک تعریفی حوالہ کو خلاف واقعہ طور پر تنقیدی حوالہ بنا دیا ہے۔

سوال

ہندستان کی کئی یونیورسٹیوں میں اور باہر کی کچھ یونیورسٹیوں میں بھی اسلامک اسٹڈیز کے نام سے شعبے قائم ہیں۔ ہمارے مدارس میں بھی اسلام کے مطالعہ کا انتظام ہے۔ یہ دونوں ایک ہیں یا ان

میں کوئی فرق ہے۔ سیکولر یونیورسٹیوں میں اور دینی مدارس میں اس اعتبار سے اگر کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟۔ (ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

سیکولر یونیورسیٹیوں میں اسلام کے مطالعہ کا تصور اس سے مختلف ہے جو ہمارے دینی مدارس میں پایا جاتا ہے۔ دینی مدارس میں اسلام کا مطالعہ ایک مقدس الہامی مذہب کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جبکہ سیکولر یونیورسٹی میں اسلام یا کسی اور مذہب کا مطالعہ صرف اسلئے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک تاریخی ظاہرہ یا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصحاب مدارس کے مطالعہ کا طریقہ داخلی (subjective) ہے اور اصحاب یونیوسٹی کا طریقہ خارجی (objective) ہے۔ اسکو ایک عملی مثال سے سمجھئے۔ مثلاً اسلام کے دور اول میں حسین ابن علی اور یزید ابن معاویہ کی فوجوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ ہوا۔ یزید ابن معاویہ کی فوج نے حسین ابن علی کو شہید کر دیا۔ اس واقعہ کو اہل مدرسہ اس نظر سے دیکھیں گے کہ حسین ابن علی پیغمبر اسلام کے نواسے تھے اور پھر اسی جذباتی وابستگی کے تحت اپنی رائے قائم کریں گے۔ اسکے برعکس سیکولر ذہن کے لوگ اسکو سادہ طور پر صرف ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے لیں گے اور بے لاگ خارجی معلومات کی روشنی میں اس کا اندازہ (assessment) کریں گے۔

اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صاحب مدرسہ سارے معاملہ کو حسین کی معصومیت اور یزید کے ظلم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ اسکے برعکس یونیورسٹی کے لوگ خالص خارجی حقائق کی روشنی میں اس پر رائے قائم کریں گے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل مدرسہ یہ کہیں گے کہ ''یزید پلید کی فوجوں نے نواسۂ رسول کو مظلومانہ طور پر شہید کیا'' اسکے برعکس دوسرا فریق یہ کہے گا کہ حسین ابن علی کے اقدام کی حیثیت دمشق کی خلافت کے نزدیک بغاوت کی تھی، اسلئے خلافت دمشق کی فوجوں نے حسین ابن علی کے خلاف جو اقدام کیا وہ وہی تھا جو ہر قائم شدہ حکومت کرتی ہے۔

اسلام کا مطلب:

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

سوال وجواب

مِز سارہ بینکرافٹ (Sarah Bincroft) لندن کے انگریزی اخبار انڈیپنڈنٹ (Independent) کی اسوسی ایٹ ایڈیٹر ہیں۔ اپریل ۲۰۰۲ء کے آخری ہفتہ میں وہ نئی دہلی میں تھیں۔ ایک ملاقات کے دوران انہوں نے اپنے کچھ سوالات لکھ کر دیئے۔ یہ سوالات مسٹر محمد خالد انصاری (ہندستان ٹائمس) نے ہمارے پاس روانہ کئے ہیں۔ یہ سوالات اُنہی کے الفاظ میں صفحہ کے نیچے درج کیے جارہے ہیں۔ اُن کے سوالات کا جواب جو انہیں بذریعہ ای میل بھیجا گیا، اس کو یہاں نمبروار نقل کیا گیا ہے۔

1. **What is the purpose of man's existence?**
2. **Once our body perishes, where exactly the life-force that leaves the body goes?**
3. **Man being caught up in a whirlpool, where each philosophy claims to be the ultimate one, how can we be sure of a particular form or shape of life after this?**
4. **if this is not the real face of Islam, then what real Islam is?**
5. **Could you suggest some useful reading meterial that, while provideing better intellectual conviction, can supercede the existing philosophy (be it Christianity,Hinduism and Juda ism etc.) about the existence of man?**

۱۔ موجودہ دنیا میں انسان کے وجود کا مقصد کیا ہے، اس سوال کو سمجھنے کے لئے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، خدا ایک آئیڈیل دنیا بنائی جس کو جنت (پیراڈائس) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ابدی اور مکمل دنیا ہے جہاں انسان وہ سب کچھ

پالے گا جو وہ چاہتا ہے۔ موجودہ مختصر دنیا وہ مقام انتخاب ہے جہاں اُن افراد کو چُنا جا رہا ہے جو موت کے بعد آنے والی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو استثنائی طور پر لامحدود استعداد (unlimited capacity) رکھتا ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ مصروف یا سب سے زیادہ کامیاب انسان بھی اپنے (mind) کا بمشکل دو فیصد حصہ کو استعمال کر سکا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا اپنی محدودیت کی بنا پر اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتی کہ جہاں کوئی آدمی اپنی پوری استعداد کے ساتھ جی سکے۔

اس مطالعہ کے مطابق، انسان کی استعداد اور قابل حصول دنیا میں ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد اس بات کا ایک قرینہ ہے کہ موجودہ دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا ہو جہاں انسان اپنے لئے پوری تکمیل (fulfilment) پا سکے، جہاں آدمی کے لئے اپنی پوری استعداد کے ساتھ جینا ممکن ہو۔ یہ گویا اس بات کی ایک نفسیاتی شہادت ہے کہ آج کی محدود دنیا کے علاوہ ایک لامحدود اور کامل دنیا موجود ہے، اسی دوسری دنیا کا نام جنت ہے۔

اس تخلیقی نقشہ کے مطابق موجودہ دنیا کی حیثیت گویا انتخاب کا ایک ابتدائی مقام ہے۔ یہاں وہ افراد چُنے جا رہے ہیں جو اپنے قول و عمل سے اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کی نفیس دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہیں۔

۲۔ موت کے بعد کیا ہوتا ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان پر جو موت واقع ہوتی ہے وہ اُس کے موجودہ جسم پر واقع ہوتی ہے، اُس کی روح پر نہیں۔ انسان ایک ایسی ہستی ہے جو تغیر پذیر چیز کی حیثیت رکھتی ہے:

personality is changelessness in change.

اسلام کے مطابق، جب کوئی انسان مرتا ہے تو وہ اپنے موجودہ مادّی جسم کو چھوڑ کر اگلی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ نئے اور زیادہ بہتر جسم کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رہ سکے۔

۳۔ بھنور (whirlpool) کا نظریہ کچھ فلسفیوں کا ایک خیالی نظریہ ہے۔ اسلام نے زندگی

کا جو تصور دیا ہے اُس میں ایسا کوئی مرحلہ نہیں۔ اسلام کے مطابق ایسا نہیں ہے کہ مرنے کے بعد ساری انسانی روحیں بھنور کی مانند کسی ایک جگہ عالم پریشانی میں اکٹھا ہو رہی ہوں۔ اسلام کے مطابق ہر انسان کا تشخص الگ ہے۔ ہر انسان اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ ہر انسان موجودہ دنیا میں اپنے قول و عمل کے ریکارڈ کے مطابق اپنی بری یا اچھی شخصیت بناتا ہے۔ اسی کے مطابق اگلی دنیا میں اُس کا اچھا یا برا انجام ہونے والا ہے۔ اچھے انجام والے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور برے انجام والے لوگ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔

۴۔ اسلام کا تصور حیات فلسفہ اور موجودہ مذاہب دونوں سے الگ ہے۔ اسلام کا تصور تمام تر امتحان (test) کے تصور پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک قسم کی تربیت گاہ ہے۔ یہاں آدمی کو آزادانہ اختیار دے کر یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ یہاں کے مختلف حالات سے گذرتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کرے۔ وہ منفی واقعات کا مثبت جواب دے، وہ ناموافق تجربات کے باوجود بلند کرداری کا ثبوت دے۔ وہ وقتی جذبات سے غیر متاثر رہ کر مستقبل کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ وہ وقتی داعیات سے غیر متاثر رہ کر ابدی حقیقتوں میں جینے کا ثبوت دے۔ وہ آزادی کے باوجود اپنی اَنا کو خدا کے آگے جھکا دے۔ وہ خود پسندی کی زندگی گذارنے کے بجائے خدا رخی زندگی (God oriented life) گذارے۔ وہ دنیا کی تعمیر کے بجائے آخرت کی تعمیر کو اپنا مقصد حیات بنائے۔

۵۔ آپ نے اپنے مطالعہ کے لئے کچھ کتابیں دریافت کی ہیں۔ اسلام کو سمجھنے کے لئے آپ کو قرآن اور حدیث رسول کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قرآن وحدیث کے علاوہ موجودہ زمانہ میں بہت سی کتابیں اسلام کے تعارف اور تشریح میں لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک راقم الحروف کی کتاب ہے جس کا نام یہ ہے: **Islam Re-discovered**

سوال

گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک کے مسلمان ذات و برادری اور مسلکی اختلافات سے یکسر کنارہ کش ہو کر اور متحد ہو کر کوئی دائمی لائحہ عمل تیار کریں۔ خصوصاً مسلم

علماء، لیڈر، دانشور اور حکومت کے اندر خدمات انجام دینے والے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ جذبات سے مغلوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمام مسلمانوں کو انصاف کی آواز بلند کرنی چاہیئے۔ جن لوگوں کو اللہ نے لائق و فائق بنایا ہے اور وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو قیامت کے دن سخت جواب دہ ہوں گے اور انہیں تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ کیا کم از کم ہم آئین کے تحت بھی ایسا کرنے کے اہل نہیں؟

(محبوب الرحمٰن پھلواری شریف)

جواب

آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان متحد ہو کر آئین کے مطابق، اپنی آواز بلند کریں، اس سے ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کو یاد نہیں کہ یہ کام بار بار کیا جا چکا ہے اور ہر بار ناکام ہوا ہے۔ چونکہ ان کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا، اس لئے آپ سمجھتے ہیں کہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت کے نام پر برصغیر کے تمام مسلمان متحد ہو گئے، مگر اس اتحاد کا مطلوب نتیجہ مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا غلغلہ بلند ہوا اور دوبارہ برصغیر ہند کے تمام مسلمان اُس کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے، مگر یہ اتحاد بھی عملاً بے نتیجہ رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس مجلس میں بھی ہر طبقے کے مسلمان شریک ہو گئے مگر اس اتحاد کے باوجود مسلمانوں کی حالت جہاں پہلے تھی وہیں اب بھی رہی۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا مگر یہ اتحاد بھی وقتی ہنگاموں کے بعد سراسر بے نتیجہ رہا، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ متحد ہو کر آواز بلند کرنا سرے سے کوئی کام ہی نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیا جائے، ان کو باشعور بنایا جائے۔ مسلمانوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنی داخلی اصلاح کر کے اپنے آپ کو مستحکم بنائیں۔ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کو سمجھیں اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ ہمارے مسئلے کا حل مثبت عمل میں ہے نہ کہ متحد ہو کر احتجاج کرنے میں۔

سوال

الرسالہ جون ۲۰۰۲ میں آپ کا مضمون ''اصل سبب جہالت'' پڑھا۔ میرے نزدیک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کے اوپر جو کچھ بیت رہا ہے اس کا اصل سبب صرف جہالت ہے۔ آپ کی اس قسم کی بے موقع تشریحات سے آپ کے مخالفین کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ آپ کو غیر ضروری طور پر بدنام کریں۔ ورنہ آپ کی مثبت فکر کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہو سکتے تھے۔ کسی بھی تبصرے کے وقت حالات کا تناظر پیش رہنا چاہیئے۔ ایک عالم دین اور ایک مصلح کی حیثیت سے آپ کے لئے مقام غور و فکر تھا کہ ایسے نازک حالات میں کس قسم کی بات کی جائے کہ مسلمانوں کو اپنے زخم خوردہ دلوں پر کوئی پھاہا محسوس ہوتا۔ مخصوص حالات کے کچھ مخصوص تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا علماء کا ہی تو کام ہوتا ہے۔ (خالد خانقاہی۔ حیدرآباد)

جواب

اس معاملہ میں اصل سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی دل پسند باتیں کہہ کر ان کے درمیان مقبولیت حاصل کی جائے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ قرآن وسنت کی رہنمائی کے مطابق ان کے مسائل کا حل کیا ہے۔ گہرے مطالعہ کے بعد ہم نے جانا ہے کہ قرآن وسنت کی رہنمائی تمام تر احتسابِ خویش پر مبنی ہے نہ کہ احتساب غیر پر۔ دوسروں کے اوپر ذمہ داری ڈالنا غیر اسلامی طریقہ ہے اور خود ذمہ داری قبول کرنا اسلامی طریقہ۔

مکی دور میں تیرہ سال تک رسول اور اصحاب رسول کو ہر طرح ستایا گیا۔ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے جو ہدایت دی گئی وہ صرف یہ تھی کہ تم ان کی ایذاؤں پر صبر اور اعراض کرو (ابراہیم ۱۲) غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو قرآن میں خود مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرو (آل عمران ۱۵۲)۔ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو مشرکین کی جارحیت کا شکار ہونا پڑا۔ اس وقت بھی یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی کمزوری کی نشاندہی کی گئی۔ (التوبہ ۲۵) حدیبیہ کے موقع پر مشرکین نے شدید حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ کیا مگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ردعمل سے بچتے ہوئے یک طرفہ طور پر متقیانہ روش اختیار کریں اور مشرکین کی شرائط پر صلح کر کے مدینہ واپس چلے جائیں (الفتح ۲۶)۔

قرآن وسنت کا مطالعہ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ مسائل کے مقابلہ میں اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ فریق ثانی کی سازشوں کا انکشاف کیا جائے۔ شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ سارا قصور صرف فریقِ ثانی کا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ سرتاسر مظلوم اور بے قصور ہیں۔ اس قسم کی روش قومی شریعت میں درست ہوسکتی ہے مگر وہ خدائی شریعت کے مطابق، سراسر بے معنیٰ ہے۔ خدائی شریعت کے مطابق کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے حصے کی غلطی کو معلوم کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ مسئلہ کا حل اپنی غلطی کی اصلاح میں ہے نہ کہ دوسروں کی زیادتیوں کا اعلان کرنے میں۔ اسلام کا نقطۂ نظر نتیجہ رُخی (Result Oriented) ہے۔ اسلام کا طریقہ دل کی بھڑاس نکالنا نہیں۔

سوال

الرسالہ مئی ۲۰۰۲ (صفحہ ۲۶) میں آپ نے لکھا ہے کہ ''اسلام کے مطابق صرف قائم شدہ حکومت ہی کو اسلحہ کے استعمال کا حق ہے۔ غیر حکومتی ادارہ کو کسی عذر کی بناء پر ہتھیار کے استعمال کا حق نہیں''۔ سوال یہ ہے کہ کسی مسلم گاؤں یا قصبہ میں اسلام دشمن عناصر اچانک حملہ کر کے ان کے معصوم بچوں کا قتل، عورتوں کی آبروریزی اور اُن کے مال واسباب کا لوٹ کھسوٹ شروع کردیں، ایسے وقت میں وہاں کے مسلمان کیا کریں؟ آیا ''اِن تصبروا وتتقوا لایضرّ کُم کیدھم شیئا'' پر عمل پیرا ہوں جسے الرسالہ نے ایسے مواقع کے لئے قرآنی اصول بتایا ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہو بیٹی کی عزت وآبرو نیلام ہوتا ہوا اور اپنے معصوم بچوں کے خون سے گھر بار نہاتا ہوا دیکھتے رہیں یا ظالم کو ظلم وتعدّی، جور وجفا، قتل وغارت گری سے روکنے کے لئے ہتھیار کا استعمال کریں؟ (محمد اسحاق فیضی، کشن گنج، بہار)

جواب

الرسالہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ نیشنل وار کے بارے میں ہے، وہ ذاتی ڈیفنس کے بارے میں نہیں ہے۔ جب ملک یا قوم کو کسی کی طرف سے حملہ کا سامنا ہو تو اُس کے مقابلہ میں دفاعی جنگ کا حق صرف قائم شدہ حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عوام کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس قسم کے حملہ کا نام لے کر آزاد تنظیمیں بنائیں اور بطور خود مسلح جنگ شروع کردیں۔ البتہ جہاں تک ذاتی دفاع کا سوال ہے

تو اس کا حق بلاشبہہ افراد کو حاصل ہے۔ تاہم یہ دفاع بھی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہونا چاہیئے، نہ کہ مسئلہ میں مزید اضافہ کے لئے۔

اس سلسلہ میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ اگر کسی گاؤں پر حملہ کریں تو اس معاملہ میں انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچ کر یہ جاننا چاہیئے کہ یہ حملہ یک طرفہ طور پر بلاسبب ہوا ہے یا وہ کسی پیشگی کاروائی کے انتقام کے لئے ہوا ہے۔ اگر وہ انتقام کا معاملہ ہے تو اس کا حقیقی حل یہ ہے کہ انتقام کے سبب کو دور کیا جائے۔ ورنہ عملاً یہ ہوگا کہ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام اور دوسرے انتقام کے بعد تیسرا انتقام لیا جاتا رہے گا اور اصل مسئلہ صرف بڑھتا رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ جو مسلمان اللہ کے راستہ میں لڑتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہوگا اور اس کو جنت میں جگہ ملے گی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلم ماں بھی جنت میں جائے گی جس نے ایسے شہید کو جنم دیا؟ (ترنم ریاض، نئی دہلی)

جواب

آخرت کا انعام کسی کو نسلی تعلق کی بنا پر نہیں ملتا۔ وہ ذاتی عمل کی بنیاد پر ملتا ہے۔ اگر کسی ماں نے اپنے بیٹے کی دینی تربیت کے لئے محنت کی اور اس کی محنت سے اس کا بیٹا سچا دیندار بنا تو اس قسم کے عمل کا ثواب ضرور ماں کو پہنچے گا۔ مگر محض نسلی تعلق کی بنا پر کسی مرد یا عورت کو کوئی ثواب ملنے والا نہیں۔

شہادت کے سلسلہ میں عرض ہے کہ مسلمان کسی کو شہید نہیں کہنے کے لفظ سے پکاریں تو ایسا کرنے سے کوئی شخص شہید نہیں بن جائے گا۔ شہادت کا تعلق تمام تر نیت سے ہے اور نیت کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ صرف اللہ یہ جانتا ہے کہ کون حقیقی معنوں میں شہید کا درجہ پانے کا مستحق ہے۔ اسی لئے امام البخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الجہاد کے ایک باب کا عنوان (ترجمہِ باب) ان الفاظ میں قائم کیا ہے: باب لا یقال فلا ن شھید (یہ نہ کہو کہ فلاں شہید ہے)۔ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۰۵۔

سوال

جب ہم لوگ قرآن کا متن پڑھتے ہیں تو اس کی بہت ساری سورتیں شعر جیسی لگتی ہیں۔ جیسے سورہ الرحمٰن اور پارہ عم۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں ہم اور ہمارے جیسے لوگوں کی دماغی صفائی کے لئے الرسالہ کے صفحات پر تشفی بخش جواب لکھ کر ہم حامیان الرسالہ کو مطمئن کریں۔ (محمد نسیم احمد، مشرقی چمپارن، بہار)

جواب

شعر کا جو معروف اسلوب ہے، اس کے مطابق قرآن شعر کی زبان میں نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ قرآن کی آیتوں میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ چنانچہ ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ:

Sound art in the Qur'an is par excellance.

مگر یہ صوتی آہنگ ادب کی زبان میں موزونیت (**rhythm**) ہے، نہ کہ شعر۔

سوال

اسلام کے فکری غلبہ کے بارے میں آپ کی بات سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تعارف اسلام کے سلسلہ میں سائنٹفک انداز تحریر جو آپ کی تحریروں میں ملتا ہے اسے حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی؟۔ امید ہے کہ ان چیزوں کی تفصیل سے آپ مجھے مطلع فرمائیں گے۔ (محمد نعمت اللہ، حیدرآباد)

جواب

اس سلسلہ میں قرآن سے دو رہنما اصول ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ داعی کا کلام اپنی زبان کے اعتبار سے عصری اسلوب میں ہو۔ یہ اصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (ابراہیم ۴) اس ضمن میں دوسرا اصول جو قرآن سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ داعی کا کلام مخاطب کے اپنے معیار کے مطابق، اتنا مدلّل ہو کہ وہ اس کو سن کر اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے۔ یہ دوسرا اصول قرآن کی اس آیت پر غور کرنے سے معلوم

ہوتا ہے: فبهت الذی کفر (البقرہ، ۲۵۸)

میرے تجربہ کے مطابق، اس قسم کے داعیانہ کلام کے لئے داعی میں حسب ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے ــــــــ اسلامی علوم کے ساتھ مدعو کے علوم کا گہرا مطالعہ، ذہنی جمود سے خالی ہونا، متعصّبانہ ذہن سے مکمل طور پر پاک ہونا، قومی فکر کے بجائے علمی فکر کا مالک ہونا، انسانیت عامہ کے ساتھ شفقت اور خیر خواہی کا تعلق ہونا، مصلحت بینی کے بجائے اعتراف کا مزاج ہونا، ہر دوسری طلب سے کٹ کر حق کا طالب بن جانا وغیرہ۔

سوال

ونسینٹ پیل (Norman Vincent Peale) اپنی کتاب "The Power of Positive Thinking" میں لکھتے ہیں کہ آپ خدا کی طاقت سے ہر کام کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ پر وہ لکھتے ہیں کہ "God is in you" یعنی خدا آپ کے اندر ہے (صفحہ ۴۴) کیا اسلامی عقیدہ کے مطابق، ایک مومن ایسا کہہ سکتا ہے کہ ''خدا انسان کے اندر ہے'' براہ کرم اسلام کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (خورشید احمد، شوپیان)

جواب

خدا کا یہ فلسفیانہ تصور وحدتِ حقیقت (Monism) کے اصول پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، دنیا کی ہر چیز خدا کے توسیعی وجود کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ انسان بھی خدا کا ایک حصہ ہے۔ مذکورہ بیان کے پیچھے دراصل یہی فکر کام کر رہا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کے نزدیک خدا اور انسان دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ خدا سے دعا کرے۔ اگر وہ اپنی دعا میں سچا اور مخلص ہے تو خدا ضرور اس کی دعا قبول کرے گا۔ مگر یہ فیصلہ کرنا خود خدا کا کام ہے کہ وہ بندہ کی دعا کو دنیا میں پورا کرے یا آخرت میں اس کا اجر عطا فرمائے۔

سوال

الرسالہ دسمبر ۲۰۰۱ کے صفحہ ۲۷ پر آپ تحریر کرتے ہیں کہ موجودہ دنیا کو خدا نے

آزمائش (test) کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ اگر اس جملہ پر غور کریں تو ماننا ہوگا کہ خدا نہ عالم الغیب ہے، نہ وہ کسی کے دل کی بات کو جانتا ہے۔ کیونکہ ٹیسٹ کا فائدہ یہی ہے کہ جو ہم نہیں جانتے تھے وہ جان جاتے ہیں۔ (ایم اے خاں، کلکتہ)

جواب

ٹسٹ (test) کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خدا خود جانے۔ ٹسٹ کا مقصد سلیکشن ہے۔ یہ ٹسٹ خدا کی نسبت سے نہیں ہے بلکہ وہ خود انسان کی نسبت سے ہے۔ یعنی انسانوں میں چھانٹ کر اچھے اور برے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک چیز جو نظری حقیقت ہے اس کو معلوم اور مشہود واقعہ بنا دیا جائے۔

سوال

ایک مسلم جماعت کے ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں جو مجلس لگتی ہے اس مجلس میں سبھی لوگوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حدیث کا مفہوم ہے کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول کا ذکر ہوتا ہے اس مجلس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہاں کوئی بدعتی مسلمان ہو تو کیا اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ برائے مہربانی آپ اس سوال کا جواب دیں (ایک قاری الرسالہ)

جواب

حدیث (صحیح مسلم، کتاب الذکر) میں مجالس الذکر کا بیان آیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسی مجالس میں شرکت کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے بخش دیا جاتا ہے۔ مگر اس بشارت کا اطلاق اس مجلس پر ہے جو اللہ کی مطلوب مجلس ہو نہ کہ کسی جماعت کے نظم کے تحت قائم کردہ مجلس۔ اسی طرح ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جو اللہ کے علم میں ذکر ہو، نہ کہ وہ ذکر جو کسی جماعت کے اپنے وضع کردہ نظام کے تحت ذکر قرار دیا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکر ایک اعلیٰ عبادت ہے مگر ذکر سے مراد ورد نہیں ہے اور نہ کسی کی تقریر کو ذکر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ذکر دراصل ایک فرد مسلم کے دل میں امنڈنے والے اس

ربانی طوفان کا نام ہے جو اللہ کی یاد سے اس کے اندر پیدا ہوا ہو۔ ذکر سے مراد وہ اعلیٰ کیفیاتی عمل ہے جو آدمی کے دل کو تڑپا دے اور اس کی آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

سوال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو جنگیں ہوئی ہیں، ان کو جہاد سے تعبیر کیوں کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس وقت مسلمانوں کی کوئی حکومت نہیں تھی اور آپ کے کہنے کے مطابق، جہاد کے لئے established government کی ضرورت ہے۔ (ایک قاری الرسالہ، کشمیر)

جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے تیرہ سالہ دور میں ظلم کے باوجود جہاد نہیں کیا۔ آپ نے صرف مدنی دور میں جہاد کیا۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ مکی دور میں اسلام کی حکومت قائم نہ تھی۔ البتہ ہجرت کے بعد مدینہ میں باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی۔ اسلئے آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد دفاع کے طور پر جہاد کیا۔

یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ مدنی دور میں وہاں اہل اسلام کی حکومت نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے آپ کا استقبال آمر اور مطاع کہہ کر کیا، یعنی حاکم اور قابل اطاعت۔ چنانچہ آپ کے مدینہ پہنچتے ہی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس کے سربراہ اوّل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

جواب دینے کے لئے جس طرح علم درکار ہے، اسی طرح سوال کرنے کے لئے بھی علم درکار ہے۔ سوال کرنے والے کو چاہیئے کہ وہ سوال کرنے سے پہلے اس کے علمی تقاضہ کو پورا کرے۔ سائل جب تک اپنے حصہ کا علمی تقاضہ پورا نہ کرلے، اس وقت تک اس کے لئے مطالعہ ہے نہ کہ سوال کرنا۔

سوال

میں کشمیر یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ میں نے اپنے ریسرچ کے متعلق آپ سے تحقیقی موضوع کا انتخاب کروایا تھا۔ آپ نے ''اردو شاعری میں سائنسی مزاج'' میرے موضوع کے

لئے انتخاب کیا تھا۔لیکن مجھے کسی بھی یونیورسٹی میں اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اب میں نے ''اقبال اور سیکولرزم'' کے تحقیقی مقالہ پر کام کرنا شروع کیا ہے۔لیکن اقبال ہمیشہ تشکیک کے شکار رہے ہیں۔اقبال کی شاعری اقبال کے تشکیکی مزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔آپ اس بارے میں میری رہنمائی فرمائیں۔(ماجد جہانگیر، کشمیر)

جواب

ہماری یونیورسٹیوں کا جو نظام ہے اس کے تحت کسی تخلیقی موضوع کے لئے ریسرچ کی اجازت ملنا بہت مشکل ہے۔اس لئے اگر آپ کی یونیورسٹی میں مذکورہ موضوع منظور نہ ہوسکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جہاں تک ''اقبال اور سیکولرزم'' کے موضوع کا تعلق ہے اس کے بارے میں میری رائے ہے کہ اقبال اور ان کے دوسرے ہم عصر مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب، وغیرہ نے موجودہ سیکولرزم کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔اقبال سمیت یہ تمام لوگ ردعمل کی نفسیات کا شکار تھے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کی ہر چیز سے متنفر تھے۔اسلئے **یغضک الشی یعمی ویصم** کے اصول کے مطابق، وہ سیکولرزم کو کھلے ذہن کے ساتھ دیکھ نہ سکے۔اس بنا پر وہ اس کو سمجھنے سے عاجز رہے۔

جس طرح ہر فکری نظام میں کچھ انتہا پسند **(extremists)** ہوتے ہیں اسی طرح سیکولرزم کے حلقہ میں بھی کچھ انتہا پسند قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔اسطرح کی انتہا پسندانہ تشریح کی بنا پر موجودہ زمانہ کے مسلم علماء اور دانشوروں نے سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت کیا۔مگر یہ ترجمہ صحیح نہ تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق، عملی طور پر جو سیکولرزم دنیا میں رائج ہوا وہ بلاشبہہ ایک موافقِ دین نظریہ تھا، نہ کہ مخالفِ دین نظریہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سیکولرزم عملی طور پر اُسی قسم کا ایک بندوبست ہے جو پیغمبر اسلام کے زمانہ میں صلح حدیبیہ کی صورت میں سامنے آیا۔سیکولرزم کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ ہے کہ اسٹیٹ مشترک قسم کے نیشنل معاملات کو چھوڑ کر مذہب اور کلچر کے معاملہ میں ناطرفداری **(non-interference)** کی

پالیسی اختیار کرے۔ اس موضوع پر میں اپنی کتاب دین کامل میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ وہاں آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

سوال

میرا ایک مسئلہ ہے جس نے مجھ کو بہت مغموم کر رکھا ہے۔ مسئلہ یوں ہے کہ بندہ بالوں کے گرنے کی پرابلم سے دوچار ہے۔ بال گرتے تو ہیں مگر دواؤں کے باوجود دوبارہ نہیں اگتے۔ کیا رب العالمین اس پر قادر نہیں۔ کیوں ایسا ہے کہ خدا نے کسی کے سر پر خوبصورت بال دیے اور کسی کو گنجا بنا دیا۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے سے نوازیں۔ (عمر رفیق، سری نگر، کشمیر)

جواب

آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ بال کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز آزمائش کے لئے ہوتی ہے، ملنا بھی اور نہ ملنا بھی۔ اسی طرح آدمی کے سر پر اچھے بال کا اگنا بھی آزمائش ہے اور بال کا جھڑنا یا سفید ہونا بھی آزمائش۔ اس آزمائش میں پورا اترنا یہ ہے کہ آدمی دونوں حالتوں کو یکساں طور پر خدا کی طرف سے سمجھے وہ ملنے پر نازاں نہ ہو اور نہ ملنا اس کو مایوسی میں مبتلا نہ کرے۔ آپ بال کے مسئلہ کے بارے میں علاج کریں مگر کسی بھی حال میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ بلکہ اللہ سے دعا کریں کہ اے اللہ، میں تیرے فیصلہ پر راضی ہوں، تو میرے لئے حسن تلافی کا فیصلہ فرما۔ مجھے آخرت میں جنت دے دے جہاں نہ کوئی بیماری ہوگی اور نہ کوئی محرومی۔

انسان کو خود سے دنیا میں کوئی مصیبت نہیں مانگنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس پر کوئی مصیبت آجائے تو اس وقت اس کو کامل صبر کی روش اختیار کرنی چاہیئے۔ یہی مومن کا طریقہ ہے اور یہی جنت کی قیمت ہے۔

سوال

میں نے اکثر مکان اور دکان میں یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا ہے براہ کرم اس کے بارے میں بتائیں۔ وہ جملہ یہ ہے ''ھذا من فضلِ ربی'' (یہ میرے خدا کا فضل ہے) یہ کوئی دعا ہے، حدیث

ہے،قرآن کی کوئی آیت ہے یا عربی مقولہ ہے؟۔کیا اس طرح کی چیزیں گھروں اور دکانوں میں ٹانگنا چاہیئے ؟ مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ ان سب چیزوں کو لٹکانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وضاحت کریں۔
(شاہ عمران حسن،مونگیر)

جواب

مذکورہ قرآنی آیت جس طرح ادھوری شکل میں مکانوں اور دکانوں میں لکھی جاتی ہے اس سے اس کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔اصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی طاقت عطا فرمائی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:قالَ هذا من فضل ربی، لیبلونی أاشکر اَم اکفر، ومن شکر فانما یشکر لنفسه ، ومَن کفر فان ربی غنی کریم (النمل ۴۰)یعنی انہوں نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔تا کہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شخص شکر کرے تو وہ اپنے ہی لئے شکر کرتا ہے اور جو شخص ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز ہے،کرم کرنے والا ہے۔

اپنی دکانوں یا مکانوں میں جو لوگ هذا من فضل ربی لکھ کر لگاتے ہیں وہ اس طرح یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دکان اور مکان جو انہیں ملا ہے وہ فضل اور انعام کے طور پر ملا ہے۔حالانکہ پوری آیت کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی مادی چیزیں اللہ کی طرف سے جس کو دی جاتی ہیں وہ اس کو بطور امتحان دی جاتی ہیں نہ کہ بطور انعام۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز امتحان کا پرچہ ہے۔جہاں تک انعام الٰہی کا تعلق ہے، وہ کسی مقبول انسان کو آخرت میں ملے گا موجودہ دنیا میں نہیں۔موجودہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں کی ہر چیز کو امتحان کی مصلحت کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

سوال

آج کے دور میں جب کہ وسائل (**resources**) کے نقطۂ نظر سے اہل یورپ وامریکہ مسلم ممالک سے کئی گنا زیادہ ترقی یافتہ ہیں،مسلمانوں کو یورپ وامریکہ کے خلاف قتال پر مبنی جہاد پر دھیان دینا چاہیئے یا اپنی طاقت وقوت بڑھانے پر؟ (زبیر احمد، بھاگل پور)

جواب

قتال اسلام میں ایک مشروط حکم ہے نہ کہ کوئی مطلق حکم ۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ نماز روزہ کی طرح قتال بھی ہر حال میں جاری رکھنا ہے۔قتال صرف اس وقت کے لئے ہے جب کہ کسی خارجی طاقت کی جارحیت کی بنا پر دفاع کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو۔اس دفاع کی بھی لازمی شرطیں ہیں۔ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر دفاعی قتال بھی جائز نہیں۔اس معاملہ کی وضاحت اس سے پہلے الرسالہ میں آچکی ہے۔

جہاں تک اہل مغرب کا تعلق ہے،ان کے مقابلہ میں ہمارا کام قتال نہیں ہے بلکہ دعوت ہے۔ عمومی طور پر سارے مسلمانوں کے لئے اور خصوصی طور پر یورپ اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لئے فرض کے درجہ میں لازم ہے کہ وہ تمام ضروری آداب وشرائط کے ساتھ ان قوموں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔یہ دعوتی کام پوری طرح پرامن انداز میں ہونا چاہیئے۔مؤثر دعوتی عمل کے لئے مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وہ معتدل فضا قائم کریں جس کے اندر دعوت کا کام مطلوب انداز میں جاری ہو سکے۔

سوال

آپ نے ۱۹۹۳ میں بابری مسجد کے مسئلہ میں جو دو نکاتی فارمولا پیش کیا تھا وہ بلاشبہہ بہترین فارمولا تھا مگر اس کے اعلان کے لئے آپ نے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا۔ایک صحیح فارمولا غلط وقت کی وجہ سے وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا جس کی ضرورت تھی۔(ایک قاری الرسالہ،ناگپور)

جواب

آپ کا یہ خیال درست نہیں ۔حقیقت یہ ہے کہ جس وقت میں نے اپنا یہ فارمولا پیش کیا وہی اس کو پیش کرنے کا موزوں ترین وقت تھا۔اس قسم کے نازک اشو وقت گزرنے کے ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس لئے اس قسم کے کسی مسئلہ پر اس کے عملی حل کا فارمولا پیش کرنے کا سب سے زیادہ صحیح وقت وہی ہوتا ہے جب کہ مسئلہ کا آغاز ہوا ہو۔اس معاملہ میں دیر کرنا گویا کہ کام کے اصل موقع کو کھو دینا ہے۔

اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ بابری مسجد کے حادثہ (۶ دسمبر ۲۰۰۲) پر دس سال گزر چکے ہیں اور ابھی بھی اس معاملہ میں کوئی مسلمان حقیقت پسندانہ فارمولا سننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ۱۹۹۲ میں یہ فارمولا قبل از وقت تھا تو اب ۲۰۰۲ میں اس کو بروقت ہو جانا چاہیئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب بھی کوئی لیڈر اس کو پیش کرنے کے لئے سامنے نہ آسکا۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافی مسائل وقت گزرنے کے بعد ہمیشہ ساکھ کا مسئلہ (**prestige issue**) بن جاتے ہیں۔ اس لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ ساکھ کا مسئلہ بننے سے پہلے اس کو حل کیا جائے۔ کیوں کہ ساکھ کا مسئلہ بننے کے بعد وہ حل ہونے والے ہی نہیں۔

سوالات (روزنامہ ہندستان، ممبئی)

۱۔ گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے، عین ممکن ہے کہ فرقہ پرستوں کی اس کامیابی کے بعد دیگر ریاستوں میں بھی اسے دہرایا جائے۔ مسلمان ہنوز منتشر ہیں تو کیا سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی گویا ہر سطح پر یہ بات مسلمانوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہے، اگر ہے تو ان حالات میں مسلمان اب کیا کریں؟۔

۲۔ گجرات یا ملک کے دیگر حصوں میں جب جب اور جہاں بھی فسادات ہوئے اور ہو رہے ہیں وہاں پر فرقہ پرستوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کون دیوبندی، بریلوی، یا شیعہ اور اہل حدیث ہے بلکہ بنام "مسلم" سب کی جان و مال کو نقصان پہنچایا اور انہیں معاشی طور پر تباہ و برباد کیا، تو کیا اب بھی مسلکی اختلافات سے چمٹے رہنا مسلمانوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہے؟ اگر ہے تو کیا اس کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھانا چاہیئے؟۔

۳۔ آج ملّت اسلامیہ کی بقاء کا مسئلہ کھڑا ہے۔ ایسے حالات میں ملّت اسلامیہ کی بقاء کیوں کر ممکن ہے؟

۴۔ ہندستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں سر گنے جاتے ہیں۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے بھی ہم مسلکی اختلافات کی بنا پر بوقت الیکشن مختلف الرائے ہو کر اپنی صفوں کو کمزور اور غیروں کی صفوں کو مضبوط بنا دیتے ہیں، تو کیا یہ مفادِ ملّت کے خلاف نہیں ہے، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟۔

۵۔ یہود و نصاریٰ مسلمانوں اور اسلام کے کٹّر دشمن ہیں، قرآن و احادیث میں بھی اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مگر ہمارے یہاں سب سے زیادہ اہمیت مسلکی اختلافات اور فرقہ بندی کو دی جاتی ہے۔ حضورؐ نے اپنی امت

میں تہتر (۷۳) فرقے بننے اور ان میں صرف ایک کے جنت میں جانے کی پیشن گوئی ضرور کی ہے مگر باقی دیگر کو اپنی امت کہا ہے، اسلام دشمن نہیں۔ ایسی صورت میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن کون۔ آیا وہ یہود و نصاریٰ جو کہ دنیا میں اسلام کے وجود کو ہی نہیں پسند کرتے یا پھر وہ کلمہ گو جو دیگر فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟۔

۶۔ اگر انتشار سے ملّت کو نقصان ہو رہا ہے تو اسلام میں اس کا کیا حل ہے؟۔

۷۔ اللہ اور اس کے رسول نے اجتماعی زندگی کو پسند کیا ہے۔ ملّت کو یکجا رکھنے کا کتنا احسن طریقہ اتحاد ہمیں دیا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دن میں پانچ بار اور ہفتے میں ایک بار اور پھر عیدین کے موقعوں پر پوری ملّت اسلامیہ مسجدوں میں یکجا ہوتی ہے جہاں پر امام کے ذریعے اپنی صفوں کو سیدھا رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اگر علماء کرام اس کی اہمیت کو سمجھ لیں اور اسے اپنا مرکز بنا کر اس اسلامی منشور پر عمل پیرا ہو جائیں تو کسی شور و غل کے بغیر پوری ملت بقائے باہم کے لئے یکجا ہو سکتی ہے جس کا اثر یہ ہوگا کہ ملک میں فرقہ پرستوں کی ہوا اکھڑ جائے گی اور تب ہم مظلوم نہیں بلکہ بادشاہ گر ہوں گے مگر ایسا نہیں ہے۔ آخر آپ لوگ مسجدوں سے ملّت کو یکجا کرنے کی تلقین کیوں نہیں کرتے؟۔

۸۔ ہندستان میں ہندوؤں کے بعد مسلمان ہی سب سے بڑی قوم ہیں۔ آپ انہیں بنام مسلم باہم متحد کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل کیوں نہیں بناتے جس سے قوم طاقتور بنے۔ مگر اس کے بجائے آپ لوگ انہیں منتشر کرنے میں پوری طاقت لگاتے ہیں، ایسا کیوں؟۔

۹۔ عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں انتشار کے لئے علماء ذمہ دار ہیں، کیا یہ سچ ہے؟۔

۱۰۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملی اتحاد کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ذاتی مفادات ہیں۔ آپ کی نظر میں ذاتی مفادات پر ملی مفاد کی کیا اہمیت ہے؟۔

۱۱۔ آپ کے نزدیک علماء کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کس بات کو دینی چاہیئے، مذہبی فرائض کی ادائیگی کو یا پھر محض دنیاوی مفاد کے لئے سیاستدانوں کا آلہ کار بننے کو؟۔

۱۲۔ کیا ایک عالم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟۔

۱۳۔ دو مصیبتیں ہیں جس میں ایک چھوٹی اور دوسری بڑی ہے۔ اگر چھوٹی مصیبت کو گلے لگانے سے بڑی مصیبت سے بچا جا سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ آیا منتشر رہ کر ملت کو بھیڑیوں

کا چارہ بننے دیں یا پھر دیگر مکتبِ فکر کے ساتھ متحد ہو کر اس بڑی مصیبت کا مقابلہ کریں؟۔

۱۴۔ خلفائے راشدین کو مذہب اسلام میں بنیاد یا ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ کیا ان کا بھی کوئی مسلک تھا؟۔ صحابہِ کرام کس مسلک سے وابستہ تھے۔ اگر وہ صرف اور صرف اسلامی قالب میں ڈھلے تھے پھر مسالک کو بنیادی حیثیت کیوں دی گئی۔ کیا مسلمان صرف اور صرف حضور اکرمؐ کے دور کا مسلمان رہ کر صحیح اور سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا ہے؟۔ (صلاح الدین جوہر انساری)

جوابات

۱۔ اس معاملہ میں کیا کریں، کا جواب یہ نہیں ہوسکتا کہ ہندستانی مسلمان اپنی الگ سیاسی محاذ بنائیں۔ وہ ملی اتحاد کے مظاہرے کریں۔ وہ احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائیں۔ وہ اپنی مظلومیت اور دوسروں کے ظلم کا اعلان کریں۔ وہ تقریر اور تحریر کے ہنگامے جاری کریں۔ اس قسم کی تدبیریں پچھلے ۵۵ سال کے عرصہ میں بہت بڑے پیمانہ پر عمل میں لائی گئی ہیں اور وہ مکمل طور پر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں۔

اب مسلمانوں کے لئے کرنے کا صرف ایک ہی کام باقی ہے جس کا ابھی تک عملی تجربہ نہیں کیا گیا، اور وہ دعوت ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل ہمیشہ دعوت کے ذریعہ ہوا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما انزل اللہ میں چھپا ہوا ہے (المائدہ ۶۷) اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوت مسلمانوں کے مسائل کا یقینی حل ہے۔ دعوت اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتی ہے۔ مگر دعوتی عمل کو انجام دینے کی ایک لازمی شرط ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان، نفرت اور کشیدگی کو یک طرفہ اعراض کے ذریعہ مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ تاکہ دونوں کے درمیان دعوت کا ماحول قائم ہو۔ شکایت واحتجاج کی بات کرنا اور اسی کے ساتھ دعوت کا نام لینا ایک مسخرہ پن ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوتی عمل۔

۲۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، وغیرہ کے درمیان موجودہ قسم کے مسلکی اختلافات ہر حال میں غلط ہیں۔ فسادات ہوں یا نہ ہوں، انہیں بہر حال ختم ہونا چاہیئے۔ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات پر یہ گروہ بندیاں کی گئی ہیں وہ دور اول میں بھی موجود تھے لیکن وہ گروہ بندی کا سبب نہیں بنے۔ ان انتہا پسندانہ اختلافات کا سبب صرف ایک ہے اور وہ شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis) ہے۔ یعنی اساسی باتوں پر زور

دینے کے بجائے جزئی باتوں پر زور دینا۔ اس برائی کو ہر حال میں ختم ہونا چاہیئے۔

۳۔ میرے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں کہ آج ملت اسلامیہ کی بقاء کا مسئلہ درپیش ہے۔ ملت اسلامیہ کو خدا کا تحفظ حاصل ہے اور قیامت تک وہ بہر حال محفوظ رہے گی۔ میرے نزدیک جس چیز کی بقاء کا مسئلہ درپیش ہے وہ ملت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ وہ طریق کار ہے جو موجودہ زمانہ میں کچھ خود ساختہ لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا گیا اور وہ پُر تشدد طریقِ کار ہے۔ میرے نزدیک تقریباً دو سال سے مسلمان جہاد کے نام پر پُر تشدد طریقِ کار اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ طریقِ کار اب آخری طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ اب وہ پوری طرح پُر امن طریقِ کار کو اختیار کر لیں۔ پُر تشدد طریقِ کار کو وہ مکمل طور پر چھوڑ دیں، براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی، لفظی بھی اور عملی بھی۔

۴۔ میرے نزدیک الیکشن میں علیٰحدہ سیاسی محاذ آرائی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہے۔ اس قسم کی جداگانہ سیاست کو انہیں مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ میرے نزدیک جداگانہ تشخص کا تعلق مذہب سے ہے۔ جہاں تک الیکشنی سیاست کا تعلق ہے۔ اس کو قومی ہونا چاہیئے، مسلمانوں کے لئے بھی اور دوسرے فرقوں کے لئے بھی۔

۵۔ یہ بات اصولاً غلط ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ قرآن و حدیث میں جن یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود و نصاریٰ ہیں، نہ کہ ہر زمانہ کے یہود و نصاریٰ۔ میرے نزدیک مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن خود وہ مسلمان ہیں جو دوسری قوموں کو اسلام دشمن بتا کر مسلمانوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اسلام کا طریقہ، اسلام دشمنوں کی نشاندہی کرنا نہیں ہے بلکہ دشمنوں کے ساتھ یک طرفہ حسن سلوک کر کے انہیں اپنا دوست بنانا ہے۔ (فصلت ۳۴)

۶۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو تفریق اور انتشار پایا جاتا ہے، اس کا سبب میرے نزدیک صرف ایک ہے اور وہ ہے، اختلاف اور تنقید پر غیر ضروری حساسیت۔ اس مسئلہ کا حل اختلاف اور تنقید کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اختلاف اور تنقید کے بارے میں اپنی غیر فطری حساسیت کو ختم کرنا ہے۔ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو برداشت کرنے سے ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔ کیوں کہ اختلافات کا مٹنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

۷۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ ان کے اندر اسلام کی ظاہری صورت یا فارم والا اسلام تو موجود ہے مگر اسلام کی روح ان کے اندر موجود نہیں۔ وہ بہت بڑے پیمانے پر اور لاکھوں مسجدوں میں ہر دن نماز کی ظاہری شکل کو دہراتے ہیں مگر نماز کی اصل روح جو اتحاد ہے، وہ ان کے اندر موجود نہیں۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کی اصل اسپرٹ کو زندہ کیا جائے جو خوف خدا اور فکر آخرت پر ہوتی ہے۔ روح کے بغیر شکل اسی طرح بے قیمت ہے جس طرح پھل کے مغز کے بغیر اس کا چھلکا۔

۸۔ جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے، میں مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش ہی میں لگا ہوا ہوں۔ میرے نزدیک مسلم اتحاد جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ قائم نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف اس طرح قائم ہوسکتا ہے کہ دلوں اور دماغوں میں روحِ اتحاد کو زندہ کیا جائے اور میں یہی کام کر رہا ہوں۔

۹۔ میرے نزدیک مسلمانوں کے انتشار کا سبب یہ ہے کہ ان کے دلوں سے اللہ کا خوف نکل گیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا مقصد، دوسری قوموں کی طرح، صرف مال کمانا اور مادّی ترقی حاصل کرنا بن گیا ہے۔ یہ مزاج ہمیشہ حسد اور نفسانیت کے جذبات کی پرورش کرتا ہے اور یہی موجودہ مسلمانوں میں بڑے پیمانہ پر پیدا ہوگیا ہے۔ اس معاملہ میں علماء اور غیر علماء کی کوئی تفریق نہیں۔

۱۰۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا گہرا جائزہ بتاتا ہے کہ ان کے اندر اجتماعی شعور موجود نہیں۔ وہ ذاتی مقاصد کی تکمیل میں اتنا زیادہ گم ہیں کہ اجتماعی مقاصد کی اہمیت کی انہیں خبر ہی نہیں۔ مسلمانوں کی اس کمزوری کی اصلاح تعلیم اور شعوری بیداری کے ذریعہ ہی کی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ موجودہ زمانہ کے علماء دو بڑی کمزوریوں کا شکار ہیں۔ ایک تقلید، جس نے انہیں ذہنی جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ وہ عصری تعلیم سے دور ہونے کی بنا پر زمانہ کے جدید حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ علماء کی ان دو کمزوریوں نے انہیں اس قابل ہی نہیں رکھا

ہے کہ وہ جدید مسلم نسلوں کی کامیاب رہنمائی کرسکیں۔

۱۲۔ سیاست میں حصہ لینا کوئی غلط یا غیر شرعی بات نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اپنی فکری اور علمی پس ماندگی کی بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ وہ سیاست میں کوئی مفید کردار ادا کرسکیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ زمانہ کے علماء نے بڑے پیمانہ پر سیاست میں عملاً حصہ لیا ہے۔ مگر وہ اپنے اس سیاسی عمل سے مسلمانوں کو تباہی کے سوا کچھ اور نہ دے سکے۔

۱۳۔ میرے نزدیک یہ مفروضہ غلط ہے کہ ملت بھیڑیوں کا چارہ بن رہی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ملت خود اپنی غلطیوں کی قیمت ادا کررہی ہے۔ جہاں تک اہون البلیتین کا تعلق ہے، وہ ایک مسلمہ شرعی اصول ہے۔ حدیث میں اس کو اختیار اَعسر کے مقابلہ میں اختیار ایسر کہا گیا ہے (صحیح البخاری)۔ حسب ضرورت اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔

۱۴۔ فقہی مسالک کوئی دور جدید کی چیز نہیں۔ وہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں موجود تھے۔ جو فرق ہے وہ یہ کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں فقہی فروق کی بنیاد پر گروہی مسالک نہیں بنے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے فروق کو لے کر انتہا پسندانہ گروہی مسالک بنا دیے گئے ہیں۔ اس معاملہ کو میں نے اپنی کتاب ''تجدید دین'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلامی شریعت کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک بنیادی احکام کا حصہ اور دوسرے ضمنی اور فروعی احکام کا حصہ۔ بنیادی احکام سب کے سب یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق واختلاف نہیں۔ مگر ضمنی اور فروعی احکام میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے احکام کے درمیان یہ فرق عین فطری ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فروعی اختلافات کو توسع اور تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے۔ ان کے معاملہ میں رواداری کا انداز اختیار کیا جائے، نہ کہ شدت پسندی کا انداز۔

سوال و جواب

(سہ ماہی السلام، نئی دہلی کے سوال نامے کا جواب)

سوالات

۱۔ اسلام اگر ایک مہذب اور مثقف مذہب ہے تو وہ دوسرے مذاہب کی توہین کیوں کرتا ہے۔ اگر اس کی روحانی اور عملی قدریں بہت بلند ہیں تو وہ دیگر اقوام کے لئے تحقیر آمیز الفاظ کیوں استعمال کرتا ہے، کیا یہ ایک مذہب کا دوسرے مذہب کے تئیں نفرت کا اظہار نہیں ہے؟

الف۔ جب مشرک کو اسلام کی مذہبی کتابوں میں نجس کہا جاتا ہے اور ان کی بنائی ہوئی چیزوں کو چھونے سے روکا جاتا ہے اور اسلامی سلطنت میں برابر کے حقوق نہیں دیئے جاتے ہیں تو کیا اسلام کا ہندو دھرم یا دیگر مذاہب کے ساتھ برا سلوک نہیں ہے؟

ب۔ اسلام کی مذہبی کتابوں میں کافر اور مشرک کا لفظ کچھ اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ اس سے ہندو دھرم کے ماننے والوں کو مراد لے کر کم تر درجے کا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کیا یہ مناسب بات ہے؟

ج۔ قرآن میں جگہ جگہ کافروں سے لڑنے اور مشرکین کا خون بہانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ بات ایسی صورت حال میں اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے جب کافر سے ہندو دھرم کے ماننے والے ہی مراد لئے جاتے ہیں، تو کیا خونریزی کی تعلیم امن وامان کے خلاف ایک نظریاتی اور عملی کوشش نہیں ہے؟

۲۔ جہاد کے بہت سے معانی ہوتے ہیں لیکن اس کا اصل معنیٰ اس قوم کے ساتھ جنگ کرنا ہے جو مسلمان نہ ہو۔ گویا مسلم قوم کی سیاسی بالادستی کے لئے لڑائی کرنا۔ کیا اس خیال کی تشہیر منطقی اور معقول بات ہے؟۔

۳۔ اسلام پر ایک الزام ہے کہ وہ نوع انسانی کو دو حصوں، مسلم و کافر میں تقسیم کرتا ہے۔ مسلمان نہ

ہونے کی صورت میں کافر قرار دیتا ہے۔ ہندو سماج کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی ہے جس کی وجہ سے دلوں میں دوریاں پیدا ہوتی ہیں، نفرت وعناد جنم لیتی ہے اور فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔

قرآن کریم کی وہ آیت جن پر اکثر وبیشتر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

الف ۔ انما المشرکون نجس (التوبہ ۲۸)

ب ۔ فاقتلوا المشرکیسن حیسث وجد تمو ھم وخذ وھم واحصروھم واقعدو الھم کل مرصد (التوبہ ۵)

ج۔ لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤ منین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شی الا ان تتقو امنھم تقٰۃ (آل عمران ۲۸)

د۔ یا ایھاالذین آمنو الا تتخذوا عدوکم اولیا ء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفر و ابماجاء کم من الحق (الممتحنۃ ۱)

ہ۔ یا ایھاالنبی جاھد الکفار والمنافقین واغلط علیھم وماواھم جھنم وبئس المصیر (التوبۃ ۷۳)

و۔ ایھا الجاھلون (قل افغیر اللہ تأ مرونی اعبد ایھا الجٰھلون) (الزمر ۶۴)

ز۔ یا ایھاالذین آمنو اقا تلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجد وافیکم غلظۃ (التوبۃ ۱۲۳)

ح۔ یا ایھاالنبی حرض المؤمنین علی القتال ، ان یکن منکم عشرون....الخ (الانفال ۶۵)

ط۔ قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ والیو م الآخرولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ ولا ید ینون دین الحق من الذین وأوتوا الکتب حتی یعطوا الجز یۃ عن یَد وھم صٰغرون (التوبہ ۹۲)

جوابات

۱۔ یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی توہین کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کو برا نہ کہا جائے۔ کیوں کہ اس سے مذاہب کے درمیان باہمی احترام کا ماحول ختم ہوتا ہے (الانعام ۱۰۸) اسی طرح یہ بات بھی سراسر بے بنیاد ہے کہ اسلام دوسری قوموں کی تحقیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے پیغمبروں نے اپنے غیر مسلم معاصرین کو ہمیشہ ''اے میری قوم'' کہہ کر خطاب کیا (الأعراف ۵۹)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے مطابق، دیگر اقوام کو نہ غیر قوم سمجھنا درست ہے اور نہ ان کے ساتھ برا سلوک کرنا جائز ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق، کھلے دشمن کے ساتھ بھی نفرت کرنا جائز نہیں (فصلت ۳۴)۔ ایسی حالت میں صرف مذہبی فرق کی بنا پر نفرت کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

الف۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اسلام میں مشرک کو عمومی طور پر نجس قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کی آیت انما المشرکون نجس (التوبہ ۲۸) کا یہ مطلب نہیں۔ یہ آیت محدود زمانی مفہوم میں ہے۔ اس میں ''المشرکون'' سے مراد صرف عرب کے وہ قدیم مشرک ہیں جو پیغمبر ﷺ کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے کسی حق کے بغیر یہ کیا تھا کہ حضرت ابراہیم کے تعمیر کیے ہوئے دار التوحید کو ظلماً دار الاصنام بنا دیا تھا۔ اس لئے رسول اللہ کے ان معاصر لوگوں کے بارے میں قرآن میں یہ حکم آیا کہ ..... یہ مشرکین نجس ہیں۔ اس لئے وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں (التوبہ ۲۸)۔

اسی طرح یہ بات بالکل غلط ہے کہ مشرکین کی بنائی ہوئی چیزوں کو چھونا اسلام میں ناجائز ہے۔ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ اس کی کوئی اصل اسلام کی تعلیمات میں نہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی بنائی ہوئی چیزوں کو مَس کیا ہے۔ حال میں کچھ لوگوں نے یہ ''فتویٰ'' دیا کہ امریکہ کی مصنوعات کو مسلمان نہ خریدیں۔ یہ بلاشبہہ ایک خود ساختہ فتویٰ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات بھی سراسر بے بنیاد ہے کہ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کو برابر کے حقوق حاصل نہیں۔ بین اقوامی

امور میں اسلام کا وہی مسلک ہے جو دوسری قوموں کا مروّجہ مسلک ہے۔ اس لئے آج اگر اسلامی ریاست قائم ہو تو اس میں غیر مسلموں کو وہی حقوق دیے جائیں گے جو اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق عالمی حقوق سمجھے جاتے ہیں (سیرت ابن ہشام، الجزاء ۴/۲۷۲)۔

ب۔ اسلام انسانی برابری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں کم تر انسان اور برتر انسان کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن کی مدنی سورتوں میں بعض مقامات پر کافر یا کفار کا لفظ آیا ہے۔ مگر یہ لفظ خدا کی طرف سے ہے، نہ کہ اہل اسلام کی طرف سے۔ مثلاً نبوت کے تیرہویں سال قرآن میں یہ آیت اُتری کہ: قل یا ایھا الکافرون (الکافرون ۱)۔ مگر رسول یا اصحابِ رسول نے کبھی اپنے ہم عصر غیر مسلموں کو ایہا الکافرون کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ و تابعین ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے جہاں کی آبادی اُس وقت غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ مگر کسی بھی ملک میں اُنہوں نے یہ نہیں کیا کہ وہاں کے لوگوں کو ''اے کافرو'' کہہ کر خطاب کریں۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ کیا کہ کوئی قوم اپنے آپ کو جو نام دیئے ہوئے تھی اُسی نام سے اُس کو پکارا۔ مثلاً شام میں نصاریٰ، فلسطین میں یہود، ایران میں مجوس، چین میں بوذا، ہندستان میں ہندو، مصر میں قبطی، وغیرہ۔

ج۔ یہ بات سراسر بے بنیاد ہے کہ قرآن میں کافروں اور مشرکوں سے لڑنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کافروں اور مشرکوں کے مقابلہ میں قرآن کا حکم اصلاً صرف ایک ہے اور وہ تبلیغ ما أنزل اللہ (المائدہ ۶۷) ہے۔ یعنی خدا کی دی ہوئی تعلیمات کو انتہائی پُر امن انداز میں لوگوں تک پہنچانا۔ اگر مخاطبین کی طرف سے اذیت رسانی ہو تب بھی پُر امن روّیہ پر قائم رہتے ہوئے پیغام رسانی کا کام جاری رکھنا۔ جہاں تک لڑائی یا جنگ کا تعلق ہے، اُس کی اجازت صرف اُس وقت ہے جب کہ اہل اسلام کے خلاف کھلی جارحیت کی جائے اور ان کو مجبورانہ دفاع کے تحت لڑنا پڑے۔ (البقرہ ۱۹۰، الحج ۳۹)۔

ہندو دھرم کے ماننے والوں کو کافر کہنا سراسر غیر اسلامی ہے، بلکہ وہ ایک گناہ کا فعل ہے۔ کافر سے مراد کوئی نسل یا گروہ نہیں۔ کافر کا مطلب ہے انکار کرنے والا۔ انکار کا تحقق صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی گروہ پر دعوت کا پُر امن عمل کیا جائے اور اُس کو تمام ضروری شرائط کی ادائیگی کے

ساتھ اتمام حجت تک پہنچا دیا جائے، اس کے باوجود وہ گروہ انکار کی روش پر قائم رہے۔ مزید یہ کہ اس انکار کا تعلق مکمل طور پر انسان کی نیت سے ہے اور نیت کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اس لئے کسی فرد یا گروہ کو کافر (منکر) قرار دینا صرف اللہ عالم الغیب کا حق ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے کوئی ایک نسل کافر (منکر) ہوسکتی ہے جس پر اتمام حجت کیا گیا ہو۔ اس کے بعد کی نسلوں پر پھر بھی اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کو کافر کا لقب نہیں دیا، وہ انہیں ان کے معروف نسبتی نام سے پکارتے رہے۔ یہ زبان پچھلے دو سال کے دوران استعمال ہوئی ہے جب کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ درحقیقت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی طرف سے احساس نفرت کا اظہار تھا، نہ کہ احساس دینی کا اظہار۔ اس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ ظہور اسلام کے بعد ایک ہزار سال تک مسلمان اپنے دور دعوت میں تھے اور اب وہ اپنے دور نفرت میں ہیں۔ کافر اور دشمن کے الفاظ دراصل مذہب نفرت کی پیداوار ہیں، نہ کہ مذہب اسلام کی پیداوار۔

خونریزی اسلام کی تعلیم ہی نہیں۔ اسلام کی تمام تعلیمات امن اور انسانی خیر خواہی پر مبنی ہیں۔ اس مسئلہ پر اسلام کے نقطۂ نظر کو میں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جو ماہنامہ الرسالہ اکتوبر ۲۰۰۲ میں ''امن کلچر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ جہاد کا لفظی مفہوم کوشش یا جدوجہد ہے۔ اس سے مراد اسلام کے دعوتی مقصد کے لئے پُرامن جدوجہد کرنا ہے۔ جہاد کا کوئی بھی براہ راست تعلق جنگ سے نہیں۔

قرآن میں جنگ کے لئے قتال کا لفظ آیا ہے۔ مگر قرآن کے مطابق، قتال کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غیر مسلموں پر مسلمانوں کا غلبہ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔ اس قسم کی جنگ قرآن کے مطابق، نہ جہاد ہے اور نہ قتال۔ بلکہ وہ ایک قومی سرکشی ہے جس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی جنگ فساد ہے، نہ کہ جہاد۔ جو نظریہ سرے سے درست ہی نہ ہو اس کی تشہیر کیوں کر معقول ہوسکتی ہے۔

۳۔ یہ سراسر الزام ہے کہ اسلام میں نوع انسانی کو مسلم و کافر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ قرآن میں بار بار ایھاالانسان اور ایھا الناس کا لفظ استعمال ہوا ہے جن کی مجموعی تعداد قرآن میں ۳۱۵ ہے۔ اس سے اور دوسری قرآنی آیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کی اصل حیثیت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ انسان ہیں۔ تمام لوگ بنی آدم ہونے کی حیثیت سے یکساں طور پر بنی آدم کا حصہ ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں کو خدائی حق کی معرفت ہو جائے اور وہ اس کو قبول کرلیں تو وہ اللہ کے نزدیک مومن قرار پائیں گے۔ ہندو سماج کے ذہن میں اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس کا سبب اسلام کی حقیقی تعلیمات نہیں ہیں بلکہ کچھ مسلمانوں کی غلط نمائندگی ہے۔ چنانچہ جو ہندو مسلمانوں کی روش سے قطع نظر کر کے براہ راست طور پر اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں وہ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے۔ اس معاملہ کی ایک مثال ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا ہیں۔ ان کا پورا واقعہ خود انہی کے الفاظ میں، راقم الحروف کی کتاب 'اسلام ری ڈسکورڈ' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے یا ہو رہے ہیں ان کا کوئی بھی تعلق اسلام کی تعلیمات سے نہیں ہے۔ وہ براہ راست طور پر دو قومی سیاست اور تقسیم ملک کی غیر فطری تحریک کا نتیجہ ہیں۔ اس کا سادہ ثبوت یہ ہے کہ اس غیر فطری اور غیر دانش مندانہ تحریک سے پہلے تقریباً ہزار سال تک ہندو اور مسلمان برصغیر ہند میں مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے درمیان کبھی وہ چیز مشاہدہ میں نہیں آئی جس کو آج کل فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فساد یقینی طور پر تقسیم کے غیر فطری عمل کا نتیجہ ہے، نہ کہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ۔

سوال نامے میں قرآن کی ۹ آیتوں کا حوالہ دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اعتراض کرنے والے انہی آیتوں کو لے کر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر یہ تمام اعتراضات صرف غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ان محولہ آیتوں کا جواب مختصر طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(الف) قرآن میں نجس کا لفظ صرف رسول کے ان معاصر لوگوں کے بارے میں آیا ہے جنھوں نے ناجائز طور پر بیت اللہ میں ۳۶۰ بت رکھ دیئے تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ آئندہ

وہ بیت اللہ کے قریب نہ آئیں (التوبہ ۲۸) یہ حکم خصوصی ہے، نہ کہ عمومی۔

(ب) قرآن کی جس آیت میں مشرکین کے قتل کا حکم ہے، اس سے مراد رسول اللہ کے وہ معاصر لوگ ہیں جو مکہ میں تھے اور جنہوں نے اپنے مسلسل عمل سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ظالم اور جارح لوگ ہیں۔ اس حکم کا دوسری اقوام یا دوسری نسلوں سے کوئی تعلق نہیں۔

(ج) قرآن کی جس آیت میں حکم آیا ہے کہ اہل ایمان اہل کفر کو اپنا اولیاء نہ بنائیں اس سے مراد زمانۂ رسالت کے مخصوص اہل کفر ہیں جنہوں نے یک طرفہ طور پر دشمنی اور جارحیت کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ یہ حکم بھی یقینی طور پر وقتی اور خصوصی ہے، نہ کہ ابدی اور عمومی۔

(د) اسی طرح قرآن کی جس آیت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے عدو سے مودت کا طریقہ اختیار نہ کریں، اس کا تعلق صرف عرب کے ایک جارح گروہ سے ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک استثنائی حکم ہے۔ جہاں تک عداوت کے مقابلہ میں اسلام کے عمومی حکم کا تعلق ہے، وہ قرآن کی سورہ نمبر ۴۱، آیت نمبر ۳۴ میں بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کو اپنے اعداء کے مقابلہ میں ردعمل کا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیئے بلکہ انہیں یک طرفہ حُسن سلوک کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

(ہ) قرآن کی جس آیت میں کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ہرگز جنگ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی منافقین سے جنگ نہیں کی۔ یہ دراصل تشدیدی لحظہ کی ایک مثال ہے جس کو مصلح بعض اوقات اصلاح کے لئے اختیار کرتا ہے۔

(و) قرآن کی جس آیت میں جاہلون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد ناواقف اور بے خبر ہونا ہے۔ یعنی بے خبر لوگوں کو ایسا کرنا نہیں چاہیئے کہ وہ باخبر شخص سے بے دلیل تکرار کرنے لگیں۔

(ز) مذکورہ آیت میں کفار سے مراد جارح کفار ہیں۔ یہ آیت بھی قرآن کے ایک خصوصی اور زمانی حکم کو بتاتی ہے، نہ کہ عمومی اور ابدی حکم کو۔ اس میں مسئلہ جارحیت کا حکم بتایا گیا ہے نہ کہ مذہبی اختلاف کا حکم۔

(ح) اس نمبر کے ذیل میں قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا تعلق ان لوگوں

سے ہے جنہوں نے یک طرفہ جارحیت کر کے اہلِ اسلام پر حملہ کر دیا ہو اور اہل اسلام کو دفاع کے طور پر ان سے لڑنا پڑے۔

(ط) اس آیت کا تعلق بھی حالت جارحیت سے ہے۔ اس آیت میں **لا یدینون دین الحق** کا لفظ صرف قید اتفاقی کے طور پر آیا ہے۔ اس حکم کا انطباق صرف دور اوّل کے کچھ لوگوں پر کیا گیا۔ اس کے بعد اس حکم کی توسیع نہیں کی گئی، جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ قرآن کی مذکورہ آیتوں کا جو مفہوم راقم الحروف نے یہاں بیان کیا ہے وہ ان آیتوں کا کوئی نیا مفہوم نہیں۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں عام طور پر ان آیتوں کا یہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور اسی کے مطابق عمل کیا جاتا رہا ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں اسلام کے اس پہلو کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب: دین انسانیت۔

تاہم موجودہ زمانہ میں کچھ مسلمانوں کو مذکورہ تشریحات اجنبی معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ایک نئی کمزوری پیدا ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی مسلمانوں میں نہ تھی اور وہ ہے غیر مسلموں کے خلاف نفرت۔ آج کل کے مسلمان عام طور پر غیر مسلموں کے بارے میں نفرت کی نفسیات میں جیتے ہیں اور جو لوگ نفرت کی نفسیات میں جیتے ہوں وہ منفی باتوں کو تو خوب سمجھیں گے مگر مثبت باتیں ان کے لئے اجنبی ہو جائیں گی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ حالت اس حدیث رسول کے عین مطابق ہے جس میں پیشگی طور پر یہ خبر دی گئی تھی کہ: **بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ** (مسلم کتاب الایمان، الترمذی کتاب الایمان، ابن ماجہ کتاب الفتن، الدارمی کتاب الرقاق، مسند احمد) یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ لوگوں کے لئے اجنبی تھا اور دوبارہ وہ لوگوں کے لئے اجنبی بن جائے گا جیسا کہ وہ پہلے اجنبی تھا۔

سوال و جواب

(پندرہ روزہ فرائیڈے اسپیشل، نئی دہلی کے سوالنامے کا جواب)

سوالات

۱۔ جماعت اسلامی کی اب تک کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟

۲۔ ایک خیال یہ ہے کہ جماعت اسلامی اقامت دین کی جدوجہد کے ساتھ اقامت سیکولرزم کے لئے بھی کوششیں کر رہی ہے۔

۳۔ جماعت اسلامی میں ممتاز علمائے کرام نظر نہیں آتے جیسا کہ ماضی میں تھا۔ کیا علماء کا طبقہ اس کی طرف نہیں آ رہا ہے۔ آخر کیوں؟

۴۔ جماعت اسلامی میں مجموعی طور پر اشاعت دین کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا جو قدیم کارکنوں کے یہاں تھا۔ کیا یہ قیادت کی کمزوری ہے یا ارکان کی تربیت میں کمی آ گئی ہے؟

۵۔ کارکنوں کے باہمی تعلقات میں بھی دوریاں پیدا ہوگئی ہیں اور ''بنیان مرصوص'' والی کیفیت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

۶۔ الیکشن کے معاملہ پر جماعت اسلامی میں اکثر و بیشتر شدید اختلافات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کیا مٹھی بھر افرادی قوت رکھنے والی پارٹی کو متنازع معاملات میں اپنی قوت صرف کرنی چاہیئے۔ بعض حلقے اسے شمالی اور جنوبی ہند کی کشمکش سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جنوبی ہند کے لوگوں کو فرقہ وارانہ عصبیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ ان میں مصالحت اور ہم آہنگی کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے جب کہ شمالی ہند کے حالات بالکل مختلف ہیں۔

۷۔ آپ کو نہیں لگتا کہ جماعت اسلامی ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئی ہے اور اس پر فکری جمود طاری ہے۔ تخلیقی لٹریچر میں جس طرح خود کو دہرایا جا رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کی بھی کمی ہوگئی ہے۔

۸۔ ''فرائیڈے اسپیشل''، عصر حاضر کے مفکر اسلام مولانا مودودیؒ پر خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہا ہے جس میں مختلف پہلوؤں سے ان کی شخصیت پر مضامین شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے تحت مولانا مرحوم کی قائم کردہ جماعت اسلامی سے متعلق مذکورہ سوال نامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس کا مفصل جواب عنایت فرمائیں گے۔

جوابات

۱۔ جماعت اسلامی کے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس نے ۱۹۴۰ کے بعد ایک معمولی تنظیم کی حیثیت سے اپنا آغاز کیا اور اب جماعت اسلامی مادی اعتبار سے ایک مؤسسہ (stablishment) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مؤسسہ کے بیشتر ظاہری لوازم اس نے اپنے گرد جمع کر لیے ہیں۔ لیکن اگر اسلام اور ملتِ اسلام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شاید جماعت اسلامی کا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں۔

اسلام کے اعتبار سے جماعت اسلامی کی سب سے بڑی فکری ناکامی یہ ہے کہ اس نے اسلام کی غلط تعبیر پیش کی۔ اس نے اسلام کو، وقت کے مروّجہ مزاج کے مطابق، سیاست کی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ اس کا ثبوت جماعت اسلامی کا پورا لٹریچر ہے۔ اس لٹریچر نے جن لوگوں کو متاثر کیا ان کا حال یہ ہوا کہ وہ اسلام کو ایک قسم کا سیاسی نظریہ سمجھنے لگے۔ نتیجۃً اسلام کا اصل پہلو، خشوع اور تقویٰ اور انابت اور اخبات اور ربانیت جیسی چیزیں اُن کے ذہن میں اپنا نتیجتاً مقام نہ پا سکیں۔ یہاں تک کہ جماعت اسلامی عملاً ایک قسم کی سیاسی پارٹی بن کر رہ گئی۔

۲۔ یہ خیال بجائے خود درست ہے۔ مگر یہ جماعت اسلامی کی مجبوری ہے، نہ کہ اس کے نقطۂ نظر سے کوئی انحراف۔ اصل یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے اقامت دین کا ایک خود ساختہ تصور پیش کیا۔ اس خود ساختہ تصور کے مطابق، اقامت دین کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کو ایک مکمل قانونی اور سیاسی نظام کے طور پر قائم کیا جائے۔ میرے نزدیک یہ نظریہ غیر اسلامی بھی تھا اور غیر حقیقی بھی۔ چنانچہ جب واقعی حالات سے سابقہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ رومانی تخیل حقائق کی دنیا میں قابل عمل ہی نہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کا مفروضہ اقامتِ دین وہاں بھی قابل عمل نہیں۔ مگر پاکستان کے مخصوص حالات کی بنا پر وہاں کم از کم یہ ممکن ہے کہ سیکولرزم کے خلاف شور وغل کا ہنگامہ جاری رکھا جائے۔ چنانچہ جماعت اسلامی پاکستان میں یہی کام کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں جماعت اسلامی کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی بن گئی جو صرف از عاج کی صفت (nuisance value) رکھتی ہے۔ وہ مشکلات پیدا کرنے والی (trouble maker) تو ضرور ہے مگر وہ کوئی تعمیری رول ادا کرنے والی نہیں۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، ۱۹۴۷ کے بعد یہاں کے افراد جماعت بھی، جماعت اسلامی کے بانی کی تقلید میں سیکولرزم کو باطل اور غیر اسلامی نظریہ بتاتے رہے۔ مگر ایک عرصہ کے بعد ان پر کھلا کہ ہندستان جیسے ملک میں سیکولرزم کو باطل قرار دینے کے بعد ان کے لئے دو میں سے ایک کا چوائس باقی رہتا ہے۔ یا تو وہ یہاں کے نظام کو طاغوتی نظام قرار دے کر اس سے لڑیں اور اس راہ میں مرتے رہیں۔ یا پھر مصالحت کا طریقہ اختیار کر کے سیکولرزم کے زیر سایہ زندگی کا استحقاق حاصل کر لیں۔

سیکولرزم کے معاملہ میں جماعت اسلامی نے یہی مصالحانہ انداز اختیار کیا۔ میرے نزدیک سیکولرزم نہ تو طاغوتی نظریہ ہے اور نہ وہ غیر اسلامی ہے۔ سیکولرزم کے تحت ہم انتہائی جائز طور پر کسی ملک میں زندگی گذار سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی اگر کھلے طور پر اس قسم کا اعلان کرتی تو وہ موجودہ تضاد کا شکار نہ ہوتی۔ مگر ایسی صورت میں اس کو یہ اعلان کرنا پڑتا کہ سیکولرزم کے بارے میں اس کا پچھلا نظریہ غلط اور انتہا پسندانہ تھا۔ اُس نے اس معاملہ میں اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا اور غلطی کا اعتراف نہ کرنے کی قیمت ہمیشہ یہ دینی پڑتی ہے کہ آدمی تضاد فکری اور تضاد عملی کا شکار ہو جائے۔

۳۔ یہ صحیح ہے کہ جماعت اسلامی کے ابتدائی دور میں کچھ ممتاز علماء وقتی طور پر اس میں شریک ہو گئے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں اصل غلطی ممتاز علماء کی ہے، نہ کہ جماعت اسلامی کی۔ یہ علماء میرے نزدیک زیادہ غور وفکر کے تحت جماعت اسلامی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر رومانی تخیل کے تحت اس میں شریک ہوئے تھے اور جب

حالات نے رومانی تخیل کو توڑ دیا تو اس کے بعد ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس سے الگ ہو جائیں ۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ ہے کہ جو علماء جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد اس سے الگ ہوئے ، ان سب کے علیٰحدگی کا ایک ہی مشترک سبب تھا اور وہ یہ کہ انہیں جماعت اسلامی کی عملی سیاست سے اختلاف تھا ، نہ کہ فکری معنوں میں اس کے نظریہ سے ۔ اصولی طور پر اس قسم کی علیٰحدگی کے لئے کوئی مبّرر (justification) موجود نہیں ۔

اس معاملہ میں صرف راقم الحروف کا استثناء ہے ۔ جماعت اسلامی سے میری علیٰحدگی عملی اختلاف کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ تمام تر فکری اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر تھی جس کی تفصیل میری کتاب ''تعبیر کی غلطی'' میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ اس لئے جماعت اسلامی سے علیٰحدگی کے لئے میرے پاس تو مبّرر ہے مگر دوسرے علماء کے پاس اس کا مبّرر نہیں ۔

۴ ۔ جماعت اسلامی کے ماضی اور حال میں یہ فرق ضرور پایا جاتا ہے ۔ مگر یہ فرق فطری ہے ۔ جماعت اسلامی کے قدیم کارکن وہ لوگ تھے جو جماعت کی پہلی نسل کی حیثیت رکھتے تھے اور اس کے موجودہ کارکن اس کی دوسری نسل کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی بھی جماعت یا تحریک کی ابتدائی نسل اور بعد کی نسل میں اس قسم کا فرق پیدا ہونا تقریباً لازمی ہے ۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے قدیم کارکن بھی اس زمانہ میں جو کام کرتے تھے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اشاعت دین کا کام نہ تھا اشاعت سیاست کا کام تھا ۔ یہ لوگ دین کے نام پر جماعت اسلامی کے بانی کا وہ لٹریچر پھیلاتے تھے جو حقیقی معنوں میں اسلام کی مطلوب تشریح نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی خود ساختہ سیاسی تشریح ہے ۔ میرے نزدیک ایسے کسی کام کو اشاعتِ دین کا عنوان نہیں دیا جا سکتا ۔

۵ ۔ کارکنوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں یہ شکایت بالکل درست ہے ۔ مگر اس کا تعلق عروج وزوال کے فطری قانون سے ہے ، نہ کہ خود جماعت اسلامی کے کسی داخلی سبب سے ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر جماعت یا تحریک کی بعد کی نسلوں میں وہی گراوٹ آجاتی ہے جس کا مشاہدہ جماعتِ اسلامی کے موجودہ افراد میں کیا جارہا ہے۔

۶۔ الیکشن کے معاملہ میں جماعت اسلامی کے لوگوں میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ جماعت کے بانی نے ''طاغوتی نظام'' کے نام سے جونظریہ پیش کیا، اس کے مطابق، سیکولر جمہوری ریاست کے اندر الیکشن میں حصہ لینا حرام قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی کے بانی نے ایک دستوری نکتہ نکال کر یہ اعلان کردیا کہ پاکستان کی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا ہے اس لئے پاکستان میں الیکشن مین حصہ لینا جائز ہوگیا ہے۔

مگر ہندستان میں یہاں کی ریاست کے بارے میں اس قسم کی ''کلمہ گوئی'' کا بہانہ موجود نہ تھا۔ ایسی حالت میں جماعت اسلامی کے مبینہ نظریہ کے مطابق، ہندستان میں الیکشن میں حصہ لینا بدستور حرام تھا۔ مگر دھیرے دھیرے جماعت اسلامی والوں کو محسوس ہوا کہ اس قسم کا نظریہ سراسر ایک غیر عملی نظریہ ہے۔

اب جماعت اسلامی والوں کے لئے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ یہ اعلان کردیں کہ ان کا طاغوتی نظام کا فلسفہ ایک انتہا پسندانہ نادانی تھی۔ وہ ایک سیاسی غلو تھا جس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔ اگر وہ اس طرح اپنی غلطی کا اعلان کردیتے تو وہ کھلے طور پر الیکشن میں حصہ لے سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا اعلان نہیں کیا۔ اس کے نتیجہ میں جماعت اسلامی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اعترافِ خطا کے بغیر الیکشن میں حصہ لینا درست سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو بانی جماعت کی تقلید میں بدستور الیکشن کو حرام سمجھ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لئے اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کردے کہ اس کا سابقہ طاغوتی نظریہ درست نہ تھا۔ اس اعلان کے بغیر یہی ہوگا کہ کچھ لوگ مصلحت پسندانہ طور پر الیکشن میں حصہ لیں گے اور کچھ لوگ تقلیدی طور پر اس کو حرام سمجھتے رہیں گے۔

۷۔ جماعت اسلامی میں ٹھہراؤ اور جمود کی بات بلاشبہہ درست ہے۔ مگر اس کا سبب لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے بلکہ جماعت اسلامی میں اعتراف کی کمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا فکر

ایک رومانی دور میں بنا۔ اس کے فطری نتیجہ کے طور پر جماعت اسلامی نے ایک ایسا فکری نظام بنایا جو عملی سے زیادہ تخیّلاتی تھا۔ اس قسم کی رومانیت (romanticism) کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے جو جماعت اسلامی کے اندر پیش آیا۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں وہ تحریک چلے جس کو عام طور پر تحریک نظر ثانی (revisionism) کہا جاتا ہے۔ یعنی جماعت اسلامی کے لوگ کھلے طور پر یہ مانیں کہ ان کی جماعت کے بانی نے فکری ناپختگی کی بنا پر غلط نظریات قائم کیے اور اسلام کی ایسی تشریح کی جس کا تعلق نہ دین سے تھا اور نہ عقل سے۔ اس حقیقت واقعہ کو مان کر جماعت اسلامی کے فکر پر نظر ثانی کی جائے اور اس کی تصحیح کر کے اس کو شریعت اور حقائق کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی مذکورہ کمزوری اپنے آپ دور ہو جائے گی۔

جماعت اسلامی جس نظریہ پر اُٹھی وہ یہ تھا کہ انسانی اقتدار کا نام طاغوت ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، موجودہ دنیا میں ہر جگہ طاغوتی نظام قائم ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس طاغوتی نظام کو توڑ کر خدائی اقتدار کا نظام قائم کرے۔ اس کوشش کے بغیر جو موت ہوگی وہ جاہلیت کی موت ہوگی۔

یہ نظریہ نہ صرف خود ساختہ تھا بلکہ وہ ناقابل عمل بھی تھا۔ اس لئے جماعت اسلامی کے لوگ دھیرے دھیرے اس نظریہ سے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ دوسری مسلم جماعتوں کی طرح، صرف ایک ملّی جماعت بن کر رہ گئے۔ اس گراوٹ کے بعد ان کے اندر وہ تمام خرابیاں آ گئیں جو کسی جماعت کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس نے اعلان کے بغیر اپنا موقف بدل لیا ہو۔ اس کے بعد جماعت اسلامی اُسی طرح ایک مسلم قومی جماعت بن گئی جس طرح آر۔ ایس۔ ایس ایک ہندو قومی جماعت ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ وہ ایک طرف آر۔ ایس۔ ایس کے آرگن، پانچ جنیہ اور آرگنائزر کے ایک سال کے شمارے اکٹھا کرے اور دوسری طرف وہ جماعت اسلامی کے آرگن دعوت اور ریڈینس کے ایک سال کے شمارے اکٹھا کرے اور پھر دونوں کا تقابلی مطالعہ کرے تو وہ پائے گا کہ الفاظ کے فرق کے ساتھ دونوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے پرچے اگر اینٹی ہندو سازشوں اور اینٹی ہندو سرگرمیوں کے انکشاف کا دفتر ہیں تو جماعت اسلامی کے پرچے اینٹی مسلم سازشوں اور اینٹی مسلم

سرگرمیوں کے انکشاف کا دفتر۔ یہ مشابہت اتنی زیادہ نمایاں ہے کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پانچ جنیہ اور آرگنائزر ہندوؤں کے دعوت اور ریڈینس ہیں اور دعوت اور ریڈینس مسلمانوں کے پانچ جنیہ اور آرگنائزر۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانچ جنیہ اور آرگنائزر پڑھنے والے ہندو جس طرح مسلمانوں کے بارہ میں منفی سوچ کا شکار ہوجاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح دعوت اور ریدینس پڑھنے والے بھی اینٹی ہندو سوچ کا شکار ہیں۔

اس منفی ذہن نے جماعت اسلامی کے افراد کو بیک وقت دو برے تحفے دیے ہیں۔ اس منفی ذہن کی بنا پر ایک طرف وہ لوگ دعوت کے قابل نہیں رہے ہیں۔ دعوت مدعو کے حق میں گہری خیر خواہی کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ اب جو لوگ اپنے مدعو کے خلاف منفی سوچ میں مبتلا ہوں وہ مدعو کے حق میں یک طرفہ خیر خواہ نہیں بن سکتے۔ اس طرح کی منفی سوچ آدمی کو دعوت کے عمل کے لئے بالکل نااہل بنا دیتی ہے۔ آج کل جماعت اسلامی کے لوگ دعوت کے نام سے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک ایک قسم کا پروفیشن ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ مشن۔ وہ صرف ایک ظاہری نوعیت کا جماعتی پروگرام ہے، نہ کہ **لعلک باخع نفسک** (الشعراء ۳) کی نفسیات کے تحت ظاہر ہونے والا کوئی ربانی عمل۔ اس منفی سوچ کا دوسرا اس سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی کا سینہ مثبت نفسیات سے خالی ہوجائے گا اور جس آدمی کا سینہ مثبت نفسیات سے خالی ہو وہ اعلیٰ ربانی احساسات کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ اس کی زندگی میں بظاہر نماز روزہ دکھائی دے گا۔ مگر اس کا یہ نماز روزہ اس کی زندگی کا صرف ایک رسمی حصہ ہوگا۔ وہ ربانی نفسیات کا اظہار نہیں ہوسکتا۔

۸۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قائم کردہ جماعت اسلامی کے بارے میں میں نے اوپر اپنے خیالات کا اظہار کردیا ہے۔ جہاں تک مولانا مودودی کی شخصیت کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میرے مطالعہ کے مطابق، وہ کوئی مفکر (thinker) نہ تھے۔ آج کل ایک عجیب رواج یہ ہوگیا ہے کہ لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کو خوش عقیدگی کے تحت مفکر لکھ دیا کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس لفظ کا یہ استعمال درست نہیں۔ آج کل جن مسلم افراد کو مفکر کا نام دیا جاتا ہے، وہ سب یا تو شاعر تھے یا خطیب تھے یا ادیب۔ ذاتی طور پر میں مولانا مودودی کو ادیب اور انشاپرداز سمجھتا ہوں، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی مفکر۔

مفکر یا تھنکر وہ ہے جو بصیرت (vision) کا حامل انسان ہو۔ جو اپنی بڑھی ہوئی تحلیلی قوت کے ذریعہ

حال میں مستقبل کو دیکھے۔ جو متفرق حقائق کو ایک داخلی وحدت (inter-related whole) میں تبدیلی کر سکے۔ جو ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان اس فرق (differnce) کو جانے جو صحت تفکیر کے لئے ضروری ہے۔ جو قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جس کی سوچ مکمل طور پر ردعمل سے خالی ہو۔ جو منفی سوچ سے پوری طرح پاک ہو اور خالص مثبت سوچ کے تحت رائے قائم کر سکے۔

میرے نزدیک موجودہ زمانہ کی مسلم شخصیتوں میں سے کوئی بھی شخصیت (بشمول مولانا مودودی) ان شرائط پر پوری نہیں اترتی۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی مفکر کہے جانے کی مستحق نہیں۔ ان لوگوں کی فکر ردعمل کے تحت بنی جب کہ مفکر وہ ہے جو ابدی حقائق کی روشنی میں سوچ سکے۔

میرے نزدیک جماعت اسلامی کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ اس نے اپنے غیر فطری نظریہ کی بنا پر اپنے پیروؤں کو ایک دوطرفہ مشکل میں ڈال دیا۔ اب ان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا چوائس موجود ہے۔ یا تو وہ جماعت کے بانی کے نظریہ کے مطابق، طاغوتی نظام سے بے فائدہ لڑائی لڑ کر اپنے آپ کو تباہ کر لیں یا اپنے اور اپنے بچوں کی انٹرسٹ کی خاطر منافق بن کر زندگی گذاریں۔

جماعت اسلامی کے مبیّنہ نظریہ کے مطابق، آج کی پوری دنیا میں طاغوتی نظام قائم ہے اور طاغوتی نظام سے سمجھوتہ ان کے نزدیک ہر حال میں حرام ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، طاغوتی نظام کے تحت رہنے کی ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اس سے مقاطعہ کر کے اس سے مسلسل جنگ کی جائے، یہاں تک کہ اسی راہ میں اپنی جان دے دی جائے۔

ظاہر ہے کہ اس انتہا پسندانہ تصور سے آدمی کا اور اس کے بچوں کا دنیوی مستقبل مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب جماعت کے تمام لوگ موجودہ طاغوتی نظام سے سمجھوتہ کر کے اس کے تحت دوسرے لوگوں کی طرح مادی تعمیر میں لگ گئے ہیں۔

میرے نزدیک موجودہ نظام کے تحت مادّی حاصل کرنا غلط نہیں۔ مگر جماعت اسلامی والوں کے لئے، وہ ان کے عقیدہ کے مطابق، حرام ہے، الّا یہ کہ وہ اپنے سابقہ نظریہ کے باطل ہونے کا اعلان کریں۔

چونکہ جماعت والوں نے ایسا اعلان نہیں کیا، اس لئے ان کی موجودہ سمجھوتہ کی زندگی صرف منافقت قرار پائے گی، نہ کہ حقیقی معنوں میں بااصول زندگی۔ (۱۱ ستمبر ۲۰۰۲)

سوال

مسلم مصنفین کی کتابوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری خدائی صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ خواہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ محروم طبقہ ہوں۔ مگر وہ برابر یہ کہتے رہتے ہیں کہ ''ساری کائنات بس ہمارے لئے تخلیق کی گئی ہے''۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''نیز حق تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ پہلی امتوں کے برخلاف اس امت کے کافروں کو عام ومستأصل عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا'' (صفحہ ۴۲۸)۔ یہ کیا معاملہ ہے، اس کی وضاحت کریں (محمد سلیم، دہلی)

جواب

۱۔ یہ بات بے بنیاد ہے کہ مسلم قوم خدا کے نزدیک کوئی افضل قوم ہے۔ شعب مختار (chosen people) کا عقیدہ خالص یہودی عقیدہ ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو فیصلہ ہوگا وہ ہر فرد کے اپنے ایمان وعمل کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ کسی قوم یا نسل یا گروہ سے وابستگی کی بنیاد پر۔

۲۔ تفسیر عثمانی کا جو اقتباس آپ نے نقل کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب عذاب مستأصل نہیں آئے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا تعلق صرف بعد کے مسلمانوں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قانون الٰہی کا تعلق اس بات سے ہے کہ اب کوئی پیغمبر دنیا میں آنے والا نہیں۔ عذاب مستأصل صرف کسی ایسی قوم پر آتا ہے جس کے درمیان کوئی پیغمبر آئے اور وہ ان پر اتمام حجت کردے۔ اس کے باوجود قوم انکار کی روش پر قائم رہے۔ ایسی ہی کسی قوم پر عذاب مستأصل آتا ہے، جیسے کہ قوم نوح، قوم ثمود اور قوم فرعون پر آیا۔ اب ختم نبوت کے بعد چوں کہ دنیا میں کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ اس لئے اب کسی کے اوپر عذاب مستأصل بھی نہیں آئے گا۔

سوال

ماحولیاتی پرابلم (Ecological Problem) کے بارے میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں ساری دنیا میں اس مسئلہ کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت زیادہ سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اگر ممکن ہو تو بتائیں کہ اسلام میں اس مسئلہ کے بارے میں کیا روشنی ڈالی گئی ہے؟۔ (کرِس فلپاٹ (Chris Philpott) برمنگھم)

جواب

ماحولیات کا مسئلہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فطرت کا قائم کیا ہوا نظام بگڑ جائے۔ ائر پولیوشن، واٹر پولیوشن، گلوبل وارمنگ، وغیرہ مسائل اس لئے پیدا ہوئے کہ جدید انڈسٹری یا جدید مشینی تہذیب کی وجہ سے فطرت کا بنایا ہوا نظام اپنی اصل حالت پر قائم نہ رہا، اس میں بگاڑ آ گیا۔

اس معاملہ میں قرآن کی رہنمائی اس اصول پر قائم ہے کہ فطرت کے قائم شدہ نظام کو درہم برہم نہ کرو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر چیز معین مقدار میں بنائی (الحجر ۱۹) اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ خدا نے دنیا کا نظام کس طرح کامل انداز میں بنایا کہ تم اس کے اندر کوئی نقص نہیں پا سکتے (الملک ۳) اسی حقیقت کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن میں انسان کو یہ حکم دیا گیا: لاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحها (الاعراف ۵۶) یعنی زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔ اس طرح کی مختلف آیتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہماری دنیا کو انتہائی متوازن (balanced) صورت میں بنایا ہے۔ اس کی ہر چیز انتہائی صحیح تناسب (right proportion) میں ہے۔ خدا جو اس دنیا کا مالک ہے اس نے اس دنیا کو انسان کے حوالہ کرتے ہوئے یہ تاکید کی کہ تم کو یہ حق حاصل ہے کہ تم دنیا کو اپنے لئے استعمال کرو۔ مگر تم کو یہ حق حاصل نہیں کہ تم اس کو بگاڑو۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ترقی کا منصوبہ اس طرح بنائے کہ دنیا میں فطرت کا قائم کیا ہوا توازن ٹوٹنے نہ پائے۔ یہاں کی مختلف چیزوں میں جو تناسب رکھا گیا ہے، وہ جیسا ہے ویسا ہی باقی رہے۔

قرآن کے مطابق، انسان کو ایک اصلاح یافتہ دنیا دی گئی ہے، انسان کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس اصلاحی حالت کو باقی رکھتے ہوئے اسے استعمال کرے۔ اگر انسان اس اصلاح میں خلل ڈالے اور وہ مسئلہ پیدا کرے جس کو مالیاتی مسئلہ کہا جاتا ہے تو خدا کے نزدیک وہ ایک مجرم قرار پائے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ نے چند دن کے لئے کسی شخص کو اپنے گھر میں مہمان رکھا۔ اب اگر وہ سمجھ لے کہ وہ اس گھر کا مالک ہے اور اس احساس کے ساتھ وہ گھر کی چیزوں کو بے قید طور پر استعمال کرنے لگے اور گھر کے اندر چیزوں کا جو نظم ہے اس کو بگاڑ ڈالے تو وہ مہمان نہ رہے گا بلکہ مجرم بن جائے گا۔

اسی طرح موجودہ دنیا گویا خدا کا ایک عالمی گسٹ ہاؤس ہے۔ انسان کو خدا نے اس گسٹ ہاؤس میں محدود مدت تک رہنے کی اجازت دی ہے۔ انسان اگر اصل مالک کی مرضی کے مطابق، یہاں رہے اور گیسٹ ہاؤس کے نظام میں خلل ڈالے بغیر اس کو استعمال کرے تو یہ اس کا جائز حق ہوگا، لیکن اگر وہ خود اپنے آپ کو اس عالمی گسٹ ہاؤس کا مالک سمجھنے لگے اور اس کے اندر قائم کئے ہوئے نظام کو درہم برہم کر دے تو اس کی حیثیت ایک ایسے مجرم کی ہو جائے گی جس کو انعام دینے کے بجائے ذلت کی سزا دی جائے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو ماحولیاتی مسئلہ موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت بے حد اہم ہے: **ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون** (الروم ۴۱) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ اللہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔

اس آیت میں عین انہی ماحولیاتی مسائل سے پیشگی طور پر خبردار کیا گیا ہے جو آج انسان کو درپیش ہیں۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، جو ماحولیاتی مسائل آج پیش آرہے ہیں، انسان کو چاہیئے کہ وہ ان ماحولیاتی مسائل کو وارننگ کے طور پر لے اور اپنی روش میں اصلاح کر کے دنیا کو دوبارہ اس اصلاحی حالت کی طرف لے جائے جو کہ صنعتی دور سے پہلے تھی۔

سوال

آپ نے الرسالہ ماہ جون ۲۰۰۲ میں لکھا ہے کہ: اسی طرح گجرات میں جن لوگوں نے جگہ جگہ خونی فساد کیا وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے، نہ کہ ہندو۔ یہ لوگ اگر تعلیم یافتہ ہوتے تو ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آتا (صفحہ ۲۶) واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا میں سارا فساد تعلیم یافتہ لوگوں ہی کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اس طالب علم کا قول ہے:

Education without ethics is an evil.

(ابن غوری، نلگنڈا)

جواب

تعلیم یافتہ سے ہماری مراد ڈگری یافتہ نہیں ہے، بلکہ شعور کا مالک ہونا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس سماج میں لوگ پڑھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں وہاں ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے، یعنی مصلحین اور عام لوگوں کے درمیان فکری بُعد (intellectual gap)۔ ہمیشہ اور ہر دور میں مصلحین ہوتے ہیں لیکن اگر سماج میں تعلیم عام نہ ہو تو لوگ ان مصلحین کی باتوں سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اس بنا پر سماج میں تربیتِ شعور کا عمل رک جاتا ہے یہی خاص حکمت ہے جس کی بنا پر تمام اعلیٰ دماغ لوگ عمومی تعلیم کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد جاب (job) حاصل کرنا ہے۔ میرے نزدیک جاب کا مسئلہ ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم یافتہ معاشرہ کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہاں مصلحین ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو کسی بات کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ جب کہ بے پڑھے لکھے سماج میں ایسے افراد موجود نہیں۔

غیر تعلیم یافتہ سماج میں لوگ ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق نہیں سمجھتے۔ وہ معاملات کا گہرا تجزیہ نہیں کرسکتے۔ مثلاً اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں میں اصل قیادت کا فقدان ہے۔ حالاں کہ یہ ایک غیر واقعی بات ہے۔ ہندستانی مسلمانوں میں اصل مسئلہ فقدانِ قیادت نہیں ہے بلکہ فقدانِ

قبولیت قیادت ہے۔ ہمارے یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان افراد کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے جو ہائی پروفائل میں بولتے ہوں، حالاں کہ دانش مند ہمیشہ لو پروفائل میں کلام کرتا ہے۔ اسی طرح باہمی نزاعات میں لوگ اکثر آئیڈیل سلوشن کی بات کرنے لگتے ہیں حالاں کہ اس طرح کے معاملات ہمیشہ پریکٹیکل سلوشن کے ذریعہ طے ہوتے ہیں۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اکثر لوگ قومی معاملات میں بولتے یا لکھتے ہیں تو وہ غیر مفاہمانہ انداز میں کلام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی لوگ خود اپنے ذاتی مسائل کو مفاہمت اور مصالحت کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی کی جبلت (instinct) ہی رہنمائی کے لئے کافی ہے جو ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے مگر ملی اور قومی معاملات میں مفاہمت اور مصالحت کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اعلیٰ شعور درکار ہے جو ایک کم تعلیم یافتہ معاشرہ میں لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

سوال

میں ماہنامہ الرسالہ کا ریگولر قاری ہوں۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند ہے کہ آپ ہمیشہ ناامیدی کے حالات میں امید کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ مایوسی کے حالات میں ہمت اور عزم پیدا کرنے والی بات کرتے ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان آپ کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو مسلمانوں کو یہ بتاتے ہیں کہ انڈیا میں اور دنیا بھر میں لوگ مسلمانوں کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں ان کی باتیں مسلمان خوب شوق سے سنتے ہیں مگر آپ مسلمانوں کو خوش خبری دیتے ہیں تو مسلمانوں کو آپ کی بات اچھی نہیں لگتی۔ ایسا کیوں ہے؟۔ (محمد اصغر، نئی دہلی)

جواب

آپ کے اس سوال پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار میں بی بی سی لندن (ہندی) سن رہا تھا۔ انہوں نے پروگرام کے مطابق، ماریشش میں مقیم ایک ہندو کا خط پڑھ کر سنایا۔ خط میں شکایت کی گئی تھی کہ بی بی سی لندن اپنے ہندی پروگرام میں ہندی بولنے والے علاقہ کی خبریں دیتا ہے مگر اس کے ہندی پروگرام میں کبھی ماریشش کی کوئی خبر نہیں آتی۔ حالانکہ ماریشش میں ہندی بولنے والے بڑی

تعداد میں رہتے ہیں۔ بی بی سی لندن کے اناؤنسر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میڈیا کا کام یہ ہے کہ وہ بیڈ نیوز (بری خبریں) نشر کرے جب کہ ماریشش میں سب اچھی خبریں ہوتی ہیں۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا:

And good news is no news.

یہی معاملہ موجودہ مسلمانوں کا ہے۔ آج کے مسلمان اپنے پریس اور اپنے اسٹیج سے اپنے بارے میں بری خبریں سنتے سنتے اس کے اپنے زیادہ عادی ہو چکے ہیں کہ اب اپنے بارے میں اچھی خبریں ان کو اجنبی معلوم ہونے لگی ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ موجودہ مسلمانوں کے اس مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

Good news is no news for a Muslim.

کسی قوم کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ واقعہ پیش آنے کے وقت پہلے ہی مرحلہ میں اس کو ہوش مند لیڈر مل جائیں۔ جیسا کہ ۲۰۰ سال پہلے امریکہ کے ساتھ پیش آیا۔ مثلاً جیفرسن، واشنگٹن، لنکن، وغیرہ۔ بدقسمتی سے انہی ۲۰۰ سالوں میں مسلمانوں کے ساتھ کئی ناخوش گوار واقعات پیش آئے۔ اس وقت کرنے کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ میں عُسر میں یُسر کا راز بتایا جائے۔ مگر ساری دنیا کے مسلم لیڈر صرف عُسر کی اصطلاحوں میں لکھتے اور بولتے رہے۔ میرے علم کے مطابق، کوئی بھی قابل ذکر مسلمان ایسا نہیں نکلا جو یُسر کی اصطلاحوں میں بات کرے۔ اس مدت میں کچھ لوگوں نے فضائل کی زبان میں کچھ بشارتیں سنائیں مگر اس قسم کی بشارتیں افیون کی گولی ہیں، نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت رہنمائی۔ اس طرح لمبی مدت تک منفی ماحول میں جینے کی وجہ سے مسلمانوں کا حال وہ ہو گیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔

اس معاملہ میں مسلمانوں کی مثال ساس اور بہو کے روایتی جھگڑے جیسی ہے۔ جو ساس اپنی بہو کے بارے میں منفی ذہنیت کا شکار ہو چکی ہو اس کے سامنے اگر بہو کی خوبیاں بیان کی جائیں تو ساس کو یقین نہیں آئے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس کی بات کو سن کر وہ غصہ ہو جائے۔ البتہ اگر بہو کی برائی بیان

کی جائے تو وہ خوب خوش ہوگی اور بلا ثبوت بہو کے خلاف باتوں کو مان لے گی۔ ٹھیک یہی معاملہ برعکس طور پر بہو کے بارے میں بھی درست ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی یہی کمزوری ہے جس کی بنا پر ان کا حال وہ ہوگیا ہے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو نہ اپنائیں گے اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اپنالیں گے (الاعراف ۱۴۶)

سوال

میں نے عالمی تاریخ کی کچھ کتابیں پڑھیں اور کچھ مورخین کے تبصرے پڑھے۔ ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے پوری انسانی تاریخ شورش اور ہنگاموں کی تاریخ ہے۔ تاریخ میں بہت کم ایسے لمحات ملتے ہیں جب کہ پرسکون اور معتدل ماحول میں انسان کو جینے کا موقع ملا ہو۔ تاریخ کے اس منظر کو دیکھ کر کچھ لوگ خدا پر شک کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر عادل ہے تو اس کی بنائی ہوئی دنیا میں اتنا زیادہ بگاڑ کیوں؟ براہ کرم اس سوال پر روشنی ڈالیں۔ (عبدالرحمٰن، ناندیڑ)

جواب

دنیا کے بارے میں مذکورہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ اس کو انسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ لیکن اگر دنیا کو خالق کی نظر سے دیکھا جائے تو نہایت آسانی سے اس کا جواب مل جاتا ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہی ہونا چاہیئے تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ موجودہ دنیا کے بارے میں خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، وہ تخلیقی نقشہ امتحان (test) کے اصول پر مبنی ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا نے انسان کو اس لئے نہیں بسایا کہ وہ یہاں عیش کرے۔ عیش کی زندگی انسان کو اس کے عمل کے مطابق، آخرت میں ملے گی۔ موجودہ دنیا کا سارا نظام اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ ہر انسان اور ہر گروہ امتحان کی کسوٹی پر آسکے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ معتدل حالات میں کسی انسان کی اصل حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ لوگ

خوبصورت لفظوں اور خوشنما کپڑوں میں اپنے آپ کو چھپائے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کو اکسپوز (expose) کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں اضطراب (disturbance) لایا جائے۔ اس معاملہ میں انسان کی مثال انڈے جیسی ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں ہر انڈا اچھا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جب انڈوں کو توڑا جائے اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون انڈا اچھا تھا اور کون انڈا خراب۔

اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ امتحان ہے اور امتحان کے لئے غیر معمولی حالات کا پیش آنا لازمی ہے۔ اس لئے بار بار ہر فرد اور گروہ کی زندگی میں غیر معمولی حالات پیدا کئے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کیسا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں حق پرست تھا یا اس نے صرف ظاہری طور پر حق کا نمائشی خول اپنے اوپر ڈال لیا تھا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا ایک ہوگئی ہے۔ اس کا خوبصورت نام گلوبلائزیشن ہے۔ مگر جیسا کہ بہت سے علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک فتنہ ہے۔ مغرب کی مسلم دشمن طاقتیں گلوبلائزیشن کے نام پر اسلام کو اپنے جال میں پھنسالینا چاہتی ہیں۔ اس نئے خطرہ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟۔ (ایک قاری الرسالہ، نئی دہلی)

جواب

گلوبلائزیشن میرے نزدیک فتنہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم نعمت ہے۔ گلوبلائزیشن سے مراد یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کمیونیکیشن اور دوسرے ذرائع اتنا زیادہ وسیع ہوگئے ہیں کہ ساری دنیا ایک گاؤں (global village) کی مانند ہوگئی ہے۔ یہ صورت حال ایک عظیم موقع ہے۔ اس دنیا میں خدا نے ہر ایک کو آزادی دی ہے۔ اس لئے دوسرے لوگ اگر اس کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کریں تو آپ کو ان کے خلاف احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے احتجاج سے یہ نہیں ہوسکتا کہ دوسرے لوگ ان مواقع سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیں۔

اصل ضرورت یہ ہے کہ ان جدید مواقع کو سمجھا جائے اور ان کو استعمال کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ اللہ اسلام کے پیغام کو ساری دنیا کے ایک ایک گھر میں پہنچا دے گا۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ حق کی اشاعت کے خدائی منصوبہ کو مکمل کیا جا سکے۔

عقبہ بن نافع تابعی افریقہ میں اسلام کا پیغام پہنچاتے ہوئے اٹلانٹک کے ساحل تک پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے کہا کہ خدا کی قسم، اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے اُس پار بھی کچھ لوگ آباد ہیں تو میں وہاں تک پہنچتا تا کہ کوئی بھی شخص اللہ کا پیغام پانے سے محروم نہ رہے۔

مگر آج اس گلوبلائزیشن کی بنا پر ہم دنیا کے ہر خطّے کے بارے میں تفصیل کے ساتھ جان چکے ہیں۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے کہ ہم با آسانی ہر جگہ پہنچ سکیں۔ پھر اسی بنا پر یہ بھی ممکن ہوا ہے کہ جدید وسائل کو استعمال کرتے ہوئے لٹریچر اور دوسری صورتوں میں بہت کم مدت میں سچائی کا پیغام زمین کے ہر گوشہ میں پہنچایا جا سکے۔

سوال

مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی تشدد پسندی کے موضوع پر کئی کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں آپ بھی اس موضوع پر لکھتے ہیں اور اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں۔ میں نے آپ کی تحریروں میں پایا ہے کہ آپ مسلمانوں کے اس تشدد کو غلط بتاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ درست ہے۔ کیوں کہ مسلمان اپنے جائز حق کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ رائے میں یہ اختلاف کیوں؟۔ (ایک قاری الرسالہ، کشمیر)

جواب

اپنے جائز حق کے لئے کوشش کرنا اور تشدد کا استعمال دونوں دو مختلف چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک کی حیثیت نظری اور اصولی ہے اور دوسرے کی حیثیت عملی طریق کار کی۔ اگر سوال یہ ہو کہ کسی شخص یا گروہ کو اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا درست ہے یا

نہیں، تو ہر شخص یہ کہے گا کہ جائز حق کے لئے کوشش کرنا اصولاً بالکل درست ہے۔

مگر جہاں تک تشدد کا سوال ہے، وہ عملی طریق کار سے تعلق رکھتا ہے اور طریق کار کے بارے میں متفقہ طور پر یہ حکم ہے کہ پُر امن طریق کار درست ہے اور پُر تشدد طریق کار درست نہیں۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو اور آدمی کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ پُر امن طریق کار اختیار کرے یا پر تشدد طریق کار، تو لازماً اس کو پُر امن طریق کار اختیار کرنا چاہیئے اور پُر تشدد طریق کار کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اپنے حق کے لئے پُر امن طریق کار کے ذریعہ جدوجہد کرنا بالکل درست ہے مگر اپنے حق کے لئے پُر تشدد طریق کار اختیار کرنا ہرگز درست نہیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ فریق ثانی جب تشدد کر رہا ہو تو ہم کیسے پرہیز کر سکتے ہیں، کیا ہم یک طرفہ طور پر مار کھاتے رہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے دعوے کے مطابق، ان پر تشدد ہو رہا ہے وہاں مسلمانوں نے خود ہی تشدد کا آغاز کیا۔ اس کے بعد فریق ثانی نے ان کے مقابلہ میں جوابی تشدد کیا۔ میرے علم کے مطابق، ہر جگہ ایسا ہی ہوا ہے۔ مسلمان اگر اپنی جدوجہد کو پُر امن طریق کار کے حدود میں رکھتے تو ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ فریق ثانی انہیں اپنی گولی اور اپنے بم کا نشانہ بنائے۔

اس معاملہ کے اصل ذمہ دار مسلم عوام نہیں ہیں بلکہ ان کے خود ساختہ لیڈر ہیں جو جوش دلا کر انہیں تشدد پر اکساتے ہیں۔ یہ مسلم لیڈر دور جدید کی ایک اہم حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ دور جدید کے مانے ہوئے اصول کے مطابق، پُر امن جدوجہد مکمل طور پر جائز ہے اور پُر تشدد جدوجہد مکمل طور پر ناجائز۔ یہ فرق آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اگر اس حقیقت کو جانتے اور اس کے مطابق، مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تو مسلمان ان تباہیوں سے بچ جاتے جو اس بین اقوامی اصول کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں انہیں پیش آ رہی ہیں۔

سوال

الرسالہ جولائی ۲۰۰۲ کے شمارے میں آپ نے صفحہ ۳۳ پر ''بے بنیاد سوچ'' کے عنوان کے تحت ایک مکالمہ تحریر فرمایا ہے جو ایک ہندو اور مسلم کے درمیان ہے۔ ''مسلمان کا یہ کہنا کہ اسلام سچا ہے، اس لئے میں بھی سچا ہوں''۔ جہاں تک جملہ کے پہلے حصہ کا تعلق ہے وہ ایک حقیقت ہے لیکن یہ کہنا کہ اسلام سچا ہے اسلئے میں بھی سچا ہوں آج تک کسی مسلمان نے ایسا کہنے کی جرأت نہیں کی اور نہ آئندہ کرے گا۔ دین کا سچا ہونا الگ بات ہے اور دین کے ماننے والوں کا سچا ہونا قطعی الگ۔ یہ ایک سراسر الزام ہے جو آپ نے ایک مسلمان پر عائد کیا ہے، ورنہ ہر مسلمان جانتا ہے اور اس کا اعتقاد بھی ہے کہ اس کے کسی بھی عمل کا سچ ہونا صرف روز محشر ہی میں ثابت ہوگا۔

آپ سے گذارش ہے کہ اپنی مثال کو اور واضح کریں تا کہ جو الزام آپ نے ایک مسلمان پر لگایا ہے اس کی وضاحت ہو جائے اور تشویش دور ہو جائے۔ (محمد بشیر، گلبرگہ)

جواب

آپ نے الرسالہ جولائی ۲۰۰۲ (صفحہ ۳۳) کے مضمون کو زیادہ غور کے ساتھ نہیں پڑھا، ورنہ یہ اشکال نہ ہوتا۔ آپ اس کو دوبارہ پڑھیں۔ اس کے بعد آپ کی غلط فہمی ختم ہو جائے گی۔ واضح ہو کہ اس مضمون میں ہندو اور مسلمان کے ''کیس'' کو بتایا گیا ہے، اس میں ان کے ''قول'' کو نہیں دہرایا گیا ہے۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ کسی کے قول کو دہرانا ایک بات ہے اور اس کے کیس کو بتانا اس سے بالکل مختلف دوسری بات ہے۔ کیس اور قول کے اس فرق کو قرآن وحدیث کے مطالعہ سے بھی جانا جا سکتا ہے اور روز مرّہ کے تجربہ سے بھی۔

اس غلط فہمی کی بنا پر آپ نے مذکورہ مضمون کو ''مکالمہ'' سمجھ لیا ہے اور اس کو الزام قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ مکالمہ نہیں ہے بلکہ وہ تجزیہ ہے۔ اگر آپ اس کو مکالمہ کے بجائے تجزیہ سمجھتے تو آپ کو ہر گز یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

سوال

میں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی ہے جس کا عنوان ہے "رسول اللہ ﷺ کی سنتیں، سائنسی وجوہات اور اُخروی فائدے"۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو سائنسی نظریے کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کروں تاکہ کلمہ میں جو کہی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے ہی میں کامیابی ہے اور دوسروں کے طریقوں میں ناکامی ہے، لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس طرح میں ایک بہترین کتاب کی شکل میں اسے لوگوں کے سامنے پیش کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑی مدد کریں۔ بتائیں کہ اس سلسلہ میں آپ کی کون سی کتابوں کا مطالعہ کروں اور کیسے اس مشن کو آگے بڑھاؤں۔ (ایک قاری الرسالہ، ناگ پور)

جواب

کتاب پوچھ کر نہیں لکھی جاتی۔ کتاب خود طوفانی احساس کے تحت لکھی جاتی ہے۔ مولانا سید سلمان ندوی سے کسی نے پوچھا کہ میں کب لکھوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ اُبلنے لگے۔ اس کے بعد لکھو۔

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں مصنف بننا چاہتا ہوں، اس کی تدبیر بتائیے۔ میرا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کوئی شخص مصنف نہیں بن سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر مشکل ترین آرٹ ہے۔ جو آدمی واقعی معنوں میں اس آرٹ کو جانتا ہو اسی کو کتاب لکھنا چاہیئے۔ بقیہ لوگوں کے لئے کتاب پڑھنا ہے، نہ کہ کتاب لکھنا۔

سوال

ایک فیکٹری میں مختلف مذاہب کے لوگ کام کرتے ہیں۔ وہاں میرے ماموں زاد بھائی بھی ایک ورکر کی حیثیت سے ہیں۔ جب میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو وہاں پر موجود دوسرے لوگوں نے مجھ سے اسلام کے متعلق سوالات کیے۔ میں نے اپنے علم کے مطابق، ان کے سوالات کے جواب دئے۔ ان سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا کہ مسلمان بے رحم اور خونخوار قوم ہے اس لئے کہ ان کی مذہبی کتاب قرآن نے خون بہانے یعنی جانوروں کو ذبح کر کے کھانے کا حکم دیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مزید یہ انسانیت کے خلاف ہے اور بے رحمی کا ثبوت بھی۔ میں نے حتی الامکان ان کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی مگر انہیں تسلی نہ ہو سکی۔ آپ اس سوال کا فکری جواب وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ (جاوید انجم سہراب علی، نئی دہلی)

جواب

جانور کو ذبح کرنا صرف مسلمان کا اصول نہیں، وہ فطرت کا عام اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی شخص حتیٰ کہ سوال کرنے والے لوگ بھی اس سے بری نہیں۔ دنیا میں بسنے والے انسانوں میں، بشمول ہندستان، بیشتر لوگ حیوانی غذا استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ بظاہر حیوانی غذا نہیں لیتے وہ بھی بالواسطہ طور پر ایسا ہی کرتے ہیں۔ پانی، دودھ، سبزی، پھل یا کوئی بھی چیز جس کو انسان کھاتا ہے ان سب میں خوردبینی زندگیاں ہوتی ہیں۔ ان زندگیوں کو قتل یا ذبح کیے بغیر کوئی شخص وٹیجیٹیرین غذا بھی نہیں لے سکتا۔ جس کو اس معاملہ میں شبہہ ہو اس سے کہیے کہ وہ دودھ کو خوردبین کے شیشے کے نیچے رکھ کر دیکھ لے۔

اصل یہ ہے کہ ذبح حیوان ہمارے لئے انتخاب (choice) کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے لئے مقدر (destiny) کا معاملہ ہے۔ موجودہ دنیا میں اس کے بغیر زندگی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ موجودہ دنیا میں اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں ذبح حیوان کے بغیر جینا چاہے تو اس کو خود اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ایسے کسی انسان کے لئے یہاں صرف خودکشی کا امکان ہے، اس کے لئے زندگی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔

سوال

میں انگریزی زبان میں کمزور ہوں۔ فکر ونظر کو تقویت بخشنے میں عربی کے ساتھ انگریزی کا کردار آپ خود اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے انگریزی زبان جس اصول وطریقہ کے مطابق سیکھی ہے اس سلسلہ میں کوئی نمونہ لکھ بھیجیں تاکہ میں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکوں۔ (رضوان اللہ الریاضی، ریاض)

جواب

کسی کا قول ہے کہ پڑھنے سے پڑھنا آتا ہے اور لکھنے سے لکھنا آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی زبان کو سیکھنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کو فوراً شروع کردے اور اس کو مسلسل

جاری رکھے۔اس معاملہ میں آدمی کا شوق اور اس کی محنت ہی اس کے سب سے بڑے معلّم ہیں۔میں نے افریقہ میں ایک تاجر کو دیکھا کہ وہ مسلسل انگریزی بولنے کی کوشش کرتا تھا۔اگرچہ اس کی زبان میں گرامر کے لحاظ سے بہت سی غلطیاں ہوتی تھیں۔کسی نے اس سے کہا کہ جب تم انگریزی نہیں جانتے تو تم کیوں بولتے ہو۔اس نے جواب دیا کہ میں غلط انگریزی بولتا ہوں تاکہ مجھے صحیح انگریزی بولنا آجائے:

I speak incorrect english. so that I

maybe able to speak correct English.

سوال

آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے یہ لکھا ہے کہ مسلمان ۲۰۰ سال سے ملٹنسی (militancy) کررہے ہیں۔کیا آپ نے ایسا لکھا ہے اور اگر لکھا ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر لکھا ہے۔براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں (ایک قاری الرسالہ۔ابوظہبی)

جواب

ایسا میں نے کبھی نہیں لکھا۔یہ بلاشبہہ ایک لغو بات ہے۔البتہ میں نے ایک اور بات لکھی ہے اور کچھ غیر ذمہ دار لوگ اس کو بگاڑ کر میرے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا کررہے ہیں۔جو لوگ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کا مصداق بن رہے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ: یحرفون الکلم عن مواضعه (المائدہ ۱۳)

میں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر مسلم مقررین اور محررین دور جدید میں اسلامی جدوجہد کا آغاز ۱۷۹۹ سے کرتے ہیں جب کہ میسور کے سلطان ٹیپو انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔اگر ۱۷۹۹ کو آغاز مانا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان ۲۰۰ سال سے اپنے مسائل کے حل کے لئے مسلح جدوجہد کررہے ہیں۔یہ مسلح جدوجہد ابھی تک مختلف مقامات پر جاری ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ۲۰۰ سال کی اس مسلح جدوجہد کا کوئی بھی مثبت نتیجہ اسلام کے لئے

یا مسلمانوں کے لئے نہیں نکلا۔ اب بھی مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے شکایت اور احتجاج کی زبان بول رہے ہیں۔ اس طرح یہ تمام لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ لمبی مدت تک اس مسلح جدوجہد کا مطلوب نتیجہ نہیں نکلا۔

اب میں کہتا ہوں کہ عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے اندر اپنے طریق کار کے بارے میں نظر ثانی (revision) کا عمل کیا جائے۔ ہندستان میں ۱۸۵۷ میں آزادی کی تحریک مسلح انداز میں شروع کی گئی۔ جب وہ بے فائدہ ثابت ہوئی تو ۱۹۱۹ میں اس طریق کار کو بدل کر آزادی کی تحریک کو پُر امن طریق کار کے اصول پر چلایا گیا۔

خود اسلام کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار صحابہ کے ساتھ ۸ ہجری میں طائف کی طرف اقدام فرمایا۔ وہاں پہنچ کر محسوس ہوا کہ بروقت حالات موافق نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے طائف کا محاصرہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف واپسی کا فیصلہ فرمایا۔ اسی طرح غزوۂ موتہ کے موقع پر ابتدائی جنگ کے بعد اندازہ ہوا کہ جنگ کا جاری رکھنا اہل اسلام کے حق میں نہیں ہے تو حضرت خالد درمیان ہی میں واپس ہو کر مدینہ آ گئے، وغیرہ۔

میں اسی نظر ثانی (revision) کی بات کرتا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ۲۰۰ سال کی مسلح جدوجہد نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلح طریق کار موجودہ حالات میں ہمارے لئے کارآمد نہیں ہے۔ اس لئے اب مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مسلح طریق کار کو مکمل طور پر چھوڑ دیں اور پر امن طریق کار کا تجربہ کریں۔ پر امن طریق کار سے مراد ہے..... مسلمانوں کی داخلی اصلاح، مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانا، مسلمانوں کے اندر اتحاد پیدا کرنا، مسلمانوں کو جدید اقتصادیات میں آگے بڑھانا، جدید وسائل کی مدد سے دعوت و تبلیغ کا کام کرنا مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا وغیرہ۔

سوال

آپ کے تعمیری انداز اور پلس طریق تعلقات اور دنیاوی اور دینی انداز عمل سے غیر متفق ہونے کا سوال ہی نہیں۔ لیکن ہم تجربہ حاصل کر رہے ہیں کہ پریکٹیکل لائف میں خیالات کی صحت

مندی کام دینے سے قاصر ہے۔لوگ، بالخصوص دیگر اور الگ الگ مذاہب کے لوگ اب بالکل ہی بے حس ہوگئے ہیں، وہ دوسروں کی پرابلم کو یا اوروں کی مصیبتوں کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔انجام کیا ہوگا؟۔(عدنان کریمی، حیدرآباد)

جواب

موجودہ زمانہ کے مسلمان اور ان کے رہنما ایک تضاد میں مبتلا ہیں۔وہ نماز روزہ کے مسائل اور حج کے آداب جیسے معاملات میں تو اسلام سے رہنمائی لینے کے لئے تیار ہیں۔مگر جہاں تک ان کے ملّی اور قومی مسائل کی بات ہے تو وہ ان معاملات میں اپنی خواہشوں پر چلنا چاہتے ہیں۔میرے نزدیک اس تضاد کی موجودگی میں ان کے مسائل کا کوئی حل نہیں۔جب تک وہ اس تضاد سے باہر نہ آئیں، ان کا کوئی بھی دنیوی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

اس سے بھی زیادہ غیر اسلامی بات یہ ہے کہ الرسالہ میں جس ایڈجسٹمنٹ کی بات کہی جاتی ہے، ہر مسلمان، عوام اور خواص دونوں اپنے ذاتی معاملات میں عین اسی ایڈجسٹمنٹ کے فارمولا پر عمل کرتے ہیں۔جہاں ان کے ذاتی انٹرسٹ کا مسئلہ ہو وہاں وہ فوراً ایڈجسٹمنٹ کے اصول کو اختیار کر لیتے ہیں۔البتہ جب انہیں ملی مسائل پر بولنا اور لکھنا ہو تو وہ ایڈجسٹمنٹ کو بزدلی کہہ کر اسے رد کر دیتے ہیں۔انفرادی اور قومی زندگی کا یہ تضاد بلاشبہہ ایک جرم ہے۔اس جرم کی موجودگی میں یہ امر بھی سخت مشتبہ ہے کہ دینی مسائل کے معاملہ میں ان کی مذکورہ روش اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول قرار پائے۔

آپ نے یہ شکایت کی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے مسائل کے حل میں ان کی مدد نہیں کرتے۔یہ ایک غیر ضروری شکایت ہے۔موجودہ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا، حتیٰ کہ رشتہ داروں کے درمیان بھی نہیں۔مسلمانوں کو یا تو اپنا مسئلہ خود حل کرنا ہوگا یا ان کے مسائل ہمیشہ غیر حل شدہ حالت میں پڑے رہیں گے۔

سوال

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں ذہین لوگوں کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ یہ سوال اس لئے ذہن میں پیدا ہوا کہ میں دیکھتا ہوں کہ ماضی میں اور حال میں بھی ذہین یا منطقی لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ مثلاً ماضی میں سید شہاب سہروردی کو قتل کر دیا گیا جب کہ وہ ابھی صرف ۳۷ سال کے تھے۔ مگر بہت ذہین انسان تھے۔ ابن رشد کو جیل میں ڈالا گیا۔ رازی، فارابی اور بوعلی سینا پر کفر کا فتویٰ لگا کر ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے یہاں سر سید احمد خاں کی تکفیر کی گئی اور انہیں ذلیل کیا گیا۔ ڈاکٹر اقبال پر بھی کفر کا الزام لگایا گیا۔ بوعلی سینا نے بھی اپنے ایک فارسی قطعہ میں کہا ہے کہ یہاں اگر رہنا ہے تو گدھا بن کر رہو اگر عقلمند بنو گے تو پھر خیر نہیں۔

کیا اسلام میں ایسے ہی لوگوں کی گنجائش ہے جو منطقی نہ ہوں، استدلالی نہ ہوں، اپنی عقل و فہم کی روشنی میں حیات و کائنات کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ (احساس آفاقی، کُرلا ممبئی)

جواب

آپ نے چند مثالوں کو لے کر ان کو جنرلائز کر دیا ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں فکری آزادی کو بہت بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اس معاملہ کی تفصیل کے لئے آپ میری کتاب دین انسانیت کا باب ''حریت فکر'' ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

قرآن میں بار بار اہل عقل کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خود قرآن کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ عقل والے اس پر غور کریں (ص ۲۹)۔ چنانچہ ہر دور میں عقلی غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ آپ نہج البلاغہ کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت علی کتنا زیادہ عقلی غور فکر کو پسند کرتے تھے۔ عباسی خلافت اور اسپین کی اموی خلافت کے دور میں عقلی غور و فکر کی زبردست حوصلہ افزائی ہوئی جس کی تفصیل آپ فلپ ہٹی کی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں دیکھ سکتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں فخر الدین رازی کی ضخیم تفسیر اور موجودہ زمانہ میں جوہری طنطاوی کی مفصل تفسیر قرآن کی عقلی تشریح کی مثالیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اسی مقصد کے لئے لکھی۔ خود راقم الحروف نے تقریباً چالیس سال سے اسلام کی عقلی اور سائنسی تشریح کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس پر سو سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں مگر ساری مسلم دنیا میں کسی بھی شخص نے اس پہلو سے میری مخالفت نہیں کی۔

تاہم بعد کے زمانہ میں ایک غلط مسئلہ مسلمانوں میں پھیل گیا اور وہ یہ کہ جو شخص رسول کی اہانت کرے یا اسلام کی اہانت کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس مسئلہ کی بنا پر کچھ لوگوں کا قتل بھی ہوا۔ مگر یہ مسئلہ بذات خود غلط ہے۔ اس کی کوئی اصل قرآن یا حدیث میں نہیں۔ اس مسئلہ کی ذمہ داری بعد کے دور کے کچھ مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، نہ کہ خود اسلام پر۔ اس معاملہ میں شرعی حکم کو سمجھنے کے لئے آپ راقم الحروف کی کتاب ''شتم رسول کا مسئلہ'' مطالعہ فرمائیں۔

سوال

آج ایسے قائد کی اشد ضرورت ہے جو ہندستانی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ آپ کی کئی کتابیں اور الرسالہ کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قیادت کے لائق صرف آپ کی شخصیت ہی ہے جو ہندستانی مسلمانوں کی احسن طور پر رہنمائی کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ علماء کرام اور دانشوروں کا طبقہ ''بغیاً بینھم'' کے مرض سے دور ہو جائیں (نثار احمد خاں سلفی، امام وخطیب مسجد اہل حدیث، مومن پورہ، ناگپور)

جواب

قیادت کا مسئلہ نامزدگی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ قبولیت کا مسئلہ ہے۔ کوئی شخص قائد اس وقت بنتا ہے جب کہ لوگوں کی اکثریت اس کو اپنے قائد کے طور پر قبول کر لے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد اور محمد علی جناح دونوں ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں نے مسلمانوں کے اندر کام کیا اور ان کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد بن گئے، لیکن ابوالکلام آزاد عملاً مسلمانوں کے قائد نہ بن سکے۔ اس کا سبب سادہ طور پر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر محمد علی جناح کو قبول کر لیا اور ابوالکلام آزاد کو قبول کرنے کے لئے وہ تیار نہ ہو سکے۔ یہی معاملہ ساری مسلم دنیا کا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ شعوری اعتبار سے پچھڑی ہوئی قوم بن گئے ہیں۔ ان میں جب تک شعوری بیداری نہ لائی جائے، کسی صالح قیادت کا ان کے اندر ابھرنا ممکن نہیں۔

حوالے

جریدہ ''الرسالہ'' ۱۹۷۶ سے متواتر ہر ماہ شائع ہو رہے ہیں لیکن اس کے تمام شماروں میں سوال و جواب کے کالم شامل نہیں ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں جن شماروں سے سوال و جواب اخذ کئے گئے ہیں ان کی تفصیلات نیچے درج ہیں۔

جنوری ۱۹۷۷ء
فروری ۱۹۷۷ء
دسمبر ۱۹۷۷ء
دسمبر ۱۹۹۱ء
نومبر ۱۹۹۸ء
دسمبر ۱۹۹۸ء
جنوری ۱۹۹۹ء
فروری ۱۹۹۹ء
اپریل ۱۹۹۹ء
جون ۱۹۹۹ء
اکتوبر ۱۹۹۹ء
دسمبر ۱۹۹۹ء
جنوری ۲۰۰۰ء
مارچ ۲۰۰۰ء
اپریل ۲۰۰۰ء
جون ۲۰۰۰ء
جولائی ۲۰۰۰ء
اگست ۲۰۰۰ء
اکتوبر ۲۰۰۰ء
جنوری ۲۰۰۱ء
اپریل ۲۰۰۱ء
مئی ۲۰۰۱ء
ستمبر ۲۰۰۱ء
دسمبر ۲۰۰۱ء
فروری ۲۰۰۲ء
اپریل ۲۰۰۲ء
نومبر ۲۰۰۲ء
دسمبر ۲۰۰۲ء

سوال وجواب

الرسالہ سے ماخوذ

فہم وتدبر انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ضروری سوال اور غیر ضروری سوال میں فرق کرے ورنہ وہ ساری عمر ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اندر صحت مند فکر کا ارتقاء نہ ہو سکے گا۔ حقیقتاً اکثر لوگ سوال کرنے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ایک شخص کو سوال اُسی وقت کرنا چاہئے جب وہ پوچھے جانے والے سوال سے متعلق غور وفکر کرے اور خاطر خواہ مطالعہ کر لے۔

Goodword

www.goodwordbooks.com
www.cpsglobal.org

ISBN 978-93-5179-181-2

9 789351 791812